

(نسل)

روغنی پستلے

مستاز مفتی

روغنی پتلے

(افسانے)

ممتاز مفتی

میری بات

میری مشکل یہ ہے کہ میں دو ہوں، ایک نہیں بن سکا۔ کوشش کے باوجود نہیں بن سکا۔ اس لیے میرا مشاہدہ خام رہا۔ میں نے اسلوب کی پھول پتیاں ضرور سجائیں، جام پر نقش و نگار بنائے لیکن مشروب میں حقیقت کی تلخی، چاشنی مستی پیدا نہ کر سکا۔ گزشتہ ۳۸ سال میں میں نے سینکڑوں کہانیاں لکھیں لیکن وہ کہانی نہ لکھ سکا جو میں لکھنا چاہتا ہوں۔ مجھ میں وہ جو ہر پیدا نہ ہوا جو قاری کا رخ بدلنے پر قادر ہو۔

میرا دامن ”بیتوں“ سے بھرا ہوا ہے لیکن میں انہیں کہانیوں میں نہ ڈھال سکا۔ خیال تھا کہ ”علی پور کا ایل“ کی دوسری جلد میں ”بیتوں“ کو پیش کروں گا لیکن یہ منصوبہ ختم کرنا پڑا۔ اس لیے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ قدرت اللہ شہاب کو بار بار بڑی عاجزی سے کہنا پڑے کہ ممتاز مفتی تو افسانہ نویس ہیں۔

قدرت اللہ کے عجز کے سحر سے بچ نکلنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ وقت یہ ہے کہ میں نے زندگی میں جو کچھ بھی پایا ہے قدرت اللہ شہاب سے پایا ہے۔ روحانی طور پر مجھ میں صلاحیت کا فقدان تھا۔ پانا ممکن نہ تھا، دریا بہتا رہا۔ میں کنارے پر سوکھا بیٹھا رہا۔ میرے نزدیک تحریر میں تاثر کو عطا سے تعلق ہے۔ میں نے حضرت دمڑی شاہ کی خدمت میں حاضری دی۔ عرض کی۔ ”حضور آپ نے حضرت میاں محمد کو قلم عطا فرمایا تھا۔ کچھ مجھے بھی عنایت ہو جائے۔“

دلی میں حضرت نظام الدین کے درپردہائی دی تھی کہ حضرت امیر خسرو کی جھولی بھری تھی۔ کچھ مجھے بھی دان کر دیجئے۔ بے شک وہ اہل تھے میں نا اہل ہوں لیکن عطا میں نہ اہل ہوتا ہے۔ نہ نا اہل، بلکہ نا اہل ہو تو دین ”سچی“ دین بن جاتی ہے۔ اگر ان بزرگوں کی جانب سے عطا ہو جائے تو شاید مرنے سے پہلے میں وہ کہانی لکھ سکوں جو لکھنا چاہتا ہوں۔

میری زندگی میں افسانے نے کئی ایک چولے بدلے۔ پہلے ترقی پسندی کے تحت مزدور اور روٹی کپڑے کی بات چلی۔ ایسی چلی کہ فیشن بن گئی۔ اسٹینس کا نشان بن گئی ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ میری تحریر بھی فیشن ہو جائے، میرا بھی اسٹینس بن جائے لیکن میں خود کو محدود نہ کر سکا۔ اس لیے ناکام رہا۔

پھر خیال افروز کہانیاں آئیں۔ جو سوچتی زیادہ تھیں۔ محسوس کم کم کرتی تھیں۔ سوچنا مجھ سے اپنا یا نہ گیا۔ میرے نزدیک ادب

سوچ نہیں جذبات ہیں۔ جو انسان کو انسان کے قریب تر لے آتے ہیں۔

اب علامتی کہانی ”ان“ ہے۔ اگرچہ وہ میری سمجھ میں نہیں آتی، پھر بھی میں نے شدت سے کوشش کی کہ علامتی بن کر ”ان“ ہو جاؤں، پھر ناکام رہا۔

ایک بات پر مجھے یقین محکم ہے کہ کہانی چاہے کتنے ہی روپ کیوں نہ بدلے سب آتے جاتے ثابت ہوں گے۔ بالآخر اسی کہانی کو قیام حاصل ہوگا جسے پڑھتے ہوئے قاری سوچے ”پھر کیا ہوا“ اب کیا ہوگا؟“

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں نے چند ایک برس کے لیے کہانی لکھنا چھوڑ دیا۔ ہوا یوں کہ میرے بیٹے عکسی مفتی نے مجھے سنجیدگی سے کہا۔ ”ابو کہانی لکھنا بند کر دیں۔“ میں نے پوچھا۔ ”کیوں؟“ کہنے لگا۔ ”اس لیے کہ آپ آج کی نئی نسل سے قطعی طور پر واقف نہیں ہیں۔ صرف ”پراکسی“ سے سمجھتے ہیں۔“ ان دنوں عکسی گارڈن کالج میں لیکچرار تھا۔ وہ نئی نسل سے بہتر رابطہ رکھتا تھا۔ ویسے بھی مجھے عکسی کی سوچ پر بہت اعتماد ہے۔ وہ ظالمانہ حد تک حقیقت پسند ہے۔ میں نے کہانی لکھنا چھوڑ دیا اور حلقہ ارباب ذوق میں جا بیٹھا۔ حلقہ کے نو جوانوں نے مجھے بصیرت بخشی۔ جیسی کیسی بھی ہے، ان ہی کی دین ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں دعویدار ہوں کہ میری کہانیوں میں جاذبیت ہوتی ہے۔ نہیں ایسی بات نہیں۔ کسی کہانی میں اثر کی عطا ہو جاتی ہے۔ کسی میں نہیں۔ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے اس مجموعے میں تیر بھی ہیں اور نکلے بھی۔

میں نے ۱۹۳۶ء میں کہانی لکھنے کی ابتدا کی تھی۔ اس دوران میں میری تحریر نے کئی ایک روپ بدلے، زاویے بدلے، رخ بدلے۔ اسلوب نے رنگ بدلے، انداز بدلے۔ یہ میرا چھٹا مجموعہ ہے۔

مجھے ایک زعم ضرور ہے۔ میں نے ہمیشہ حتی الوسع کوشش کی ہے کہ اظہار میں رسمی بیان نہ آئے، بات میں سادگی ہو، روانی ہو، سچائی ہو۔ میری تحریر میں کتابی رنگ پیدا نہ ہو۔ کہانی لکھی نہ جائے، کہی نہ جائے، سنائی نہ جائے۔

یہ کہانیاں لکھ کر میں نے اردو ادب کی کوئی خدمت نہیں کی، الٹا اردو ادب نے مجھ پر احسان کیا ہے کہ مجھے گوارا کیا۔ میں نئی نسل کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنا یا۔

حلقہ ارباب ذوق، سلسلہ اور رابطہ کا شکر گزار ہوں کہ میرا حوصلہ بندھایا۔ اور فیروز سنز کے ظہیر سلام کو خدا خوش رکھے کہ انہوں نے میری طبعی تلخی کے باوجود مجھ سے مہربانی کا سلوک روا رکھا۔



سندرتا کاراکشش

شام دبے پاؤں رینگ رہی تھی۔

ٹیلے پر درختوں کے سائے پھیلتے جا رہے تھے لیکن چوٹی کی جھولی سورج کی تھکی ماندی کرنوں سے ابھی تک بھری ہوئی تھی۔
سوامی جی کی کنیا کا دروازہ صبح سے بند تھا۔ بالکا اور داس دونوں درختوں کی چھاؤں تلے بیٹھے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔
ہر چند ساعت بعد وہ سراٹھا کر سوامی جی کی کنیا کے دروازے کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھتے کہ کب دروازہ کھلے اور درشن کے
بھاگ جاگیں لیکن دروازہ نہیں کھلتا تھا۔

صبح داس نے تھالی میں بھوجن پر دس کر سوامی جی کے دروازے پر رکھ دیا لیکن اب تک تھالی جوں کی توں دھری تھی۔ نہ دروازہ
کھلا نہ سوامی جی نے بھوجن اٹھایا۔ اب وہ رات کے بھوجن کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ پاس ہی بالکا منجھ کے بنے ہوئے جوتے کی
مرمت کر رہا تھا۔ دور ٹیلے کے مغربی کونے کے پرے شہر کے مکانات صاف دکھائی دے رہے تھے جیسے ماچس کی روغنی ڈبیاں نیچے
اوپر دھری ہوں۔ شہر کے لو بھی بھنورے کے مدھم بھی بھن صاف سنائی دے رہے تھی۔ دفعتاً اس کے منہ سے ایک چیخ سی نکلی۔ ”ہے
رام“ اور چاقو اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

”ہاتھ کٹ گیا کیا؟“ بالکے نے سراٹھا کر پوچھا۔

”ناہیں مہاراج وہ دیکھو۔۔۔۔۔ ادھر۔“

بالکے نے ادھر دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ٹیلے کے مغربی کنارے پر دو لڑکیاں ان کی طرف آ رہی تھیں۔
چست لباس پہنے بال پھلائے مکھ سجائے پرس جھلاتی ہوئی۔ یوں جیسے وہ سوامی جی کا آشرم نہیں بلکہ پلنگ سپاٹ ہو۔
”یہ تو کالج کی دکھتی ہیں مہاراج۔“ داس نے کہا۔

”آج کل تو سبھی کالج کی دکھتی ہیں۔“ بالکے نے جواب دیا۔ ”کیا مانتا کیا پتری۔۔۔۔۔“ بالکا اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور گھبراہٹ
میں ٹیلے لگا۔

داس چھلے ہوئے آلوؤں کی کوپھر سے چھیلنے میں لگ گیا۔ ٹیلے پر گھبراہٹ بھری خاموشی کے ڈھیر لگ گئے۔ وقت تھم گیا۔

پھر ایک لوچدار آواز نے تتلی کی طرح پر پھڑ پھڑائے۔ ”ہمیں سوامی جی سے ملنا ہے۔“ بالکے نے سراٹھایا۔

شیلا اور بھلا کی کٹوراسی آنکھیں دیکھ کر بالکے نے گھبرا کر سر جھکا لیا اور بولا ”سوامی جی کی کنیا کے دوار کے پٹکل سے بند ہیں دیوی۔ انہوں نے صبح کو بھوجن بھی نہیں اٹھایا۔“

”تو دوار کے پٹ کھول دو۔“ شیلا بولی۔

”ہمیں اس کی آگیا نہیں دیوی۔“

”سوامی جی کو بھی تو دوار بند کرنے کی آگیا نہیں۔“ بھلا غصے سے چلائی۔ ”اگر پر ماتما کا دوار بھی بند ہو گیا تو منگتوں کا کیا ہوگا؟“

”یہ سن کر بالکے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سدھ بدھ ماری گئی۔ اب کیا جواب دے۔ کوئی ہو تو دے۔ ٹیلے پر خاموشی طاری ہو گئی۔ پھر داس اٹھا۔ اس نے لپک کر چٹائی اٹھائی اور کنیاؤں کے سامنے بچھا کر نیچی نگاہوں سے بولا ”بیٹھو شرمیسی بیٹھو۔“

”ہمارے پاس بیٹھنے کا ٹائم نہیں۔“ شیلا نے کہا۔

”سوامی جی سے کوئی مانگ کرنا ہے یا پوچھنا ہے۔“ داس نے پوچھا۔

”مانگ بھی پوچھنا بھی۔“ شیلا نے کہا۔

”ہم تمہارا سندیس پہنچا دیں گے دیوی۔“ بالکا بولا۔

”اونہوں“ شیلا نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ”ہم خود سوامی جی سے بات کریں گے۔“

”پر دیوی جی سوامی جی استریوں سے نہیں ملتے۔“ بالکے نے کہا۔

”کیا کہا؟“ شیلا اور بھلا دونوں چلائیں۔

”کیا وہ پرش اور استری کو برابر نہیں جانتے؟“ شیلا نے تلخی سے پوچھا۔

بالکے نے سر اٹکا لیا اور چپ سا دھلی۔ اب وہ کہے کیا جواب دے۔

ٹیلے پر خاموشی چھا گئی۔ گہری لمبی خاموشی۔

آخر شیلا زیر لب بولی۔ جیسے خود سے کہہ رہی ہو۔ اس کی آواز میں مایوسی کی جھلک تھی۔ ”بے کار ہے بھلا استری کے لیے پر ماتما کا دوار بھی بند ہے۔ یہاں بھی اندھیر نگری ہے۔ یہ ویش بھی پریش کا ویش نکلا۔“

بھلا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ چلا کر بولی۔ ”سوامی جی پرش سے ملتے ہیں استری سے نہیں۔ کیا سوامی جی استری سے ڈرتے ہیں۔“

”آج بھی۔۔۔۔۔؟“ بملا نے پوچھا۔

”ہاں آج بھی۔ اس کی ڈھونڈ آج بھی جاری ہے۔“

یہ سن کر شیلہ بملا کو چپ لگ گئی۔ سائے اور بھی لمبے ہو گئے۔

درختوں کی ٹہنیاں ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے لگیں۔ سورج کے لہو نے رس رس کر بادلوں کو رنگ دیا۔ وقت رک گیا۔

پھر شیلہ کی مدھم آواز آئی۔ ”بالکا جی، وجے وقتی کون تھی؟“

اور پھر بالکے نے وجے وقتی کی کہانی سنانا شروع کی۔ بالکا بولا۔۔۔۔۔

”وجے وقتی راج گڑھی کے مہاراج ماتری راج کی رانی تھی۔ مہاراج کا سنگھاسن اس کے چرنوں میں دھرا تھا۔ مہاراج اسے آنکھوں

پر بٹھاتے۔ وارے نیارے جاتے۔۔۔۔۔ اس کی کوئی بات نہ ٹالتے۔ الٹا پلے باندھ لیتے۔ انہیں وجے سب رانیوں سے پیاری

تھی۔ کیسے نہ ہوتی۔ سندر تا میں وہ سب سے اتم تھی۔ صرف ناک نقشہ ہی نہیں اس کی چال ڈھال رنگ روپ سبھاؤ سبھی کچھ سندر تا میں

بھیگا ہوا تھا۔ پلکیں اٹھاتی تو دیئے جل جاتے۔ ہونٹ کھلتی تو پھول کھل اٹھتے۔ بانہہ ہلاتی تو ناگ جھولتے۔ بھرپور نجر سے دیکھتی تو

رنگ پچکاری بھگو کر رکھ دیتی۔ مہاراج راج بھون میں بڑے آنند سے جیون گجار رہی تھی۔“

بالکا رک گیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد بولا ”پھر ایک روز آدھی رات کے سے مہارانی کا دوا ر بجا۔ وہ سمجھی مہاراج آئے ہیں۔ اٹھ کر

دروازہ کھولا تو کیا دیکھتی ہے کہ مہاراج نہیں بلکہ ایک بوڑھی کھوسٹ استری کھڑی ہے۔

”کون ہے تو؟“ وہ غصے سے چلائی۔

اس کی آواز سن کر مہارانی کی باندی شوشی جاگ اٹھی اور دوڑ کر دروازے پر آ گئی۔ اس کی اتنی جان کہ آدھی رات کو مہارانی کا

دروازہ کھٹکھٹائے۔ رانی نے بڑھیا سے کہا۔ ”کون ہے تو؟“ شوشی بڑھیا کی طرف جھپٹی۔

”میں شوبالا ہوں۔“ بڑھیا نے جواب دیا۔ ”میرا دارو کھتم ہو گیا ہے۔ دارو بنا میری رات نہیں کٹے گی۔ میں نے سوچا کہ رانی

کے آگے جھولی پھیلاؤں۔ جو کرپا کریں تو میری رات کٹ جائے۔“

”تو استری ہو کے دارو پیتی ہے۔“ رانی نے گھن کھا کر جھر جھری لی۔

”نہ مہارانی، جو میں استری ہوتی تو دارو پینے کی کیا جرورت تھی۔ جب میں استری تھی تو دارو نہیں پیتی تھی۔ پلایا کرتی تھی۔ لیکن

اب۔۔۔۔۔ اب میں وہ دن بھولنے کے لیے دارو پیتی ہوں۔“

”یہ کیا کہہ دیا بالک مہاراج؟“ داس بولا۔

دوار کا داس بالک نے کہا۔ ”سچ بولو سچ کو اپناؤ سچ جیو پر متو سچ کی ڈھونڈ میں نہ نکلتا۔ سدا چلتے رہو گے۔ چلنے کے پھیر میں آ جاؤ گے۔ نہ رستہ ہوگا۔ نہ ڈنڈی نہ اور۔۔۔۔۔ اور نہ کہیں پہنچو گے۔ صرف چلنا چلتے رہنا۔“ بالک نے آہ بھری اور کہانی سنانے لگا۔ بولا۔۔۔۔۔ ”لاکھ سمجھانے پر بھی وجے رانی سچ کی ڈھونڈ میں چل نکلی۔ سب سے پہلے اس نے مہاراج کو پرکھنے کی ٹھانی کہ وہ مجھے برابر کا جانے ہیں کہ نہیں۔ اس کے من میں چنتا کا کاٹا لگ گیا۔ جوں جوں اس کی چنتا بڑھتی گئی۔ توں توں مہاراج اسے اپنے دھیان کی گود میں جھلاتے گئے۔ اس کے سامنے یوں سیس نواتے گئے جیسے وہ سچ مچی کی دیوی ہو۔ جوں جوں وہ دیوی کو مناتے گئے توں توں رانی کی کلپنا بڑھتی گئی۔ مہاراج مجھے مورتی نہ بنائیے۔ مندر میں نہ بٹھائیے۔ اپنے پاس بٹھائیے۔ اپنے برابر جانیے۔ مہاراج کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ برابر کیسے جانیں۔ جسے دھیان دیا جائے۔ مان دیا جائے۔ اونچا بٹھایا جائے۔ وہ برابری کیوں چاہے۔ جسے سارا دیا جائے وہ آدھا کیوں مانگے؟

وجے رانی کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ مہاراج اسے دیوی کے سامن بنا سکتے ہیں، مہارانی بنا سکتے ہیں، چیتا سمجھ سکتے ہیں، ساتھی نہیں بنا سکتے۔ یہ جان کر وجے نے ٹھان لی کہ وہ راج بھون کو چھوڑ دے گی۔ رانی نہیں بلکہ استری بنکر بنے گی۔ سندر تا کے جو پر نہیں، جیو کے جو پر۔ بھسوت مل کر سندر تا چھپائے رکھے گی اور کسی کے ساتھ بیاہ نہ کرے گی جب تک وہ اسے برابر کی نہ سمجھے، ساتھی نہ جانے۔ پھر ایک رات جب گرج چمک جو روں پر تھی اور راج بھون کے چوکیدار کونوں میں سہمے بیٹھے تھے تو وجے نے بھیس بدلا اور شوشی کو ساتھ لے کر چور دروازے سے باہر نکل گئی۔ چلتے چلتے وہ راج نگری سے دور ایک شہر میں رکیں۔ وجے گجارے کے لیے پھلکاریاں بناتی۔ شوشی انہیں باجا جا کر بیچ دیتی۔

کچھ دنوں میں وجے کی پھلکاریاں کی مانگ بڑھ گئی۔ ”اتنی صاف ستھری پھلکاریاں کون بناوے ہے؟“ منڈی میں باتیں ہونے لگیں۔ پھر بدیش سے ایک گھرو بیو پاری آند آ نکلا۔ پھلکاریاں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ اس نے شوشی کو ڈھونڈ نکالا۔ بولا ”یہ پھلکاریاں کون کاڑھتی ہے؟ مجھے اس کے پاس لے چل۔“ شوشی اسے گھر لے آئی۔ وجے کو دیکھ کر وہ پھلکاریاں بھول گیا۔ وجے پھلکاریاں دکھاتی رہی۔ آند وجے کو دیکھتا رہا۔ وجے سمجھتی تھی کہ بھسوت سندر تا کو ڈھانپ لیتی ہے۔ آند سوچتا رہا کہ جس گن کو استری اچھالتی ہے، یہ شریستی اسے چھپا رہی ہے۔ اوش کوئی بھید ہے۔

آند بہت سیانا تھا۔ اس نے شہر شہر کا پانی پی رکھا تھا۔ اس نے سوچا، پاؤں دھیرے دھیرے دھرو۔ بڑی پھسلن ہے اور جو گراتو

یہاں سہارا دے کر اٹھانے والا کوئی نہیں۔ پہلے تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ پھر پاؤں دھرنا۔ تو وہ تیل کی دھار جانچنے کے لیے بھٹکار یوں کے بہانے وجے کے گھر آنے جانے لگا۔

دو چار پھروں میں اسے پتہ چل گیا کہ سندر تا کی بات نہیں چلے گی۔ پریم کی بات نہیں چلے گی۔ ملائم بات نہیں چلے گی۔ لگاؤ کی بات نہیں، بے لاگ، کھردری، گنوار۔

وہ بولا ”بی کاڑھن‘ تو تو چیونٹی کی چال چلے ہے۔ پر مجھے تو بہت سی پھلکاریاں چاہئیں تاکہ انہیں بیچ کر اپنا پیٹ پال سکوں۔“

پھر چار ایک دن کے بعد آئندہ جے سے بہت بگڑا۔ سب جھوٹ موٹ۔ بولا ”تو کام چور ہے ری۔ میں تیرے سر پر بیٹھ کر کام کراؤں گا۔“ اس بہانے وہ سارا سارا دن و جے کے گھر رہنے لگا۔ جوں جوں وہ اس کے نیڑے ہوتا گیا۔ اس کا من ہاتھوں سے نکلتا گیا۔

پھر ایک دن آمند نے اس کی بانہہ پکڑ لی۔ بولا ”بی کاڑھن میرا دھندا نہیں چلتا۔ اتنی کمائی بھی نہیں ہوتی کہ سوکھا گجارہ کر سکوں۔ جو تو مجھ سے بیاہ کر لے تو جیون سکھی ہو جائے۔ تو پھلکاریاں کاڑھے میں انہیں بیچوں۔ کام تیرا دوڑ دھوپ میری۔“

وہ اس چال میں آگئی۔ اس کی ممتا جاگ اٹھی۔ بولی ”میں تو اس سے بیاہ کروں گی جو تپنی کو برابر کا سمجھے۔ نہ اسے دیوی بنائے نہ باندی۔ اپنا ساتھی جانے۔ دکھ کا ساتھی۔“

”ٹھیک ہے۔“ آند بولا ”تو میری ساتھن ہے، ساتھن رہے گی۔“
جب وجہ دلہن بنی تو بھجوت کا پردہ بھی اٹھ گیا۔ اندر سے رانی نکل آئی۔ آند دھک سے رہ گیا۔ پر بھوا ایسی مورتی۔۔۔۔۔۔“

مالکار رک گیا۔

داس منہ کھولے بیٹھا تھا۔ چولہا جل رہا تھا۔ تو اوجو کھالی پڑا تھا تپ تپ کر گلا ہو گیا تھا۔ پیڑا ہاتھ میں یوں دھرا تھا جیسے بالک کے ہاتھ کا کھدو ہو۔

شیلہ کی نگاہیں گھاس پر بچھی ہوئی تھیں جیسے ڈھونڈ میں لگی ہوں۔ بھلا کی آنکھیں ڈبڈبا رہی ہوں۔ اب روئی کہ اب روئی۔
 نیلے پر سائے منڈلا رہے تھے۔ بادلوں میں آگ جل رہی تھی۔ شام دبے پاؤں جا رہی تھی۔ رات اپنے پھر پھر اڑ رہی تھی۔ ”پھر
 کیا ہوا بالک جی؟“ داس نے جیسے پچکی لی۔

بالک بولا ”آئندہ بہت بڑا سوداگر تھا۔ حویلیاں تھیں۔ نوکر چاکر تھے۔ دھن دولت تھی۔ کس بات کی کمی تھی اسے۔ وہ تو وجہ کو رام

کرنے کے لیے اس نے نرو دھن کا سوانگ رچایا تھا۔ بس ایک بات سچ تھی۔ وہ تن من دھن سے وجے کا ہو چکا تھا۔

اس کا باہر جانے کو جی نہیں چاہتا پر کیا کرتا۔ اتنا بڑا بیو پار تھا۔ اس کی دیکھ بھال تو کرنی ہی تھی۔ اسے جانا ہی پڑتا۔ پھلکاریاں بیچنے کے بہانے چلا جاتا۔ دونوں باہر رہتا۔ چلا جاتا تو جیسے گھر کا دھیان ہی نہ ہو۔ آ جاتا تو جیسے جانے سے ہول کھاتا ہو۔

پھر یہ بھی تھا کہ اس نے وجے کو پھلکاریاں کاڑھنے سے روک دیا تھا۔ بولا ”تجنی تو سال میں ایک ٹھاٹھ کی پھلکاری بنا دیا کر۔ ایسی جو راجارانی جوگی ہو۔ ایسی جو ایک بیچ لی تو گھر میں لہر بہر ہوگئی۔“

اس پر وجے سوچ میں پڑ گئی۔ سوچتی رہی۔ سوچتی رہی۔ جب وہ آیا تو اسے کہنے لگی۔ ”رے تو مجھ سے اپنے بیو پار کی بات کیوں نہیں کرتا؟“

آنند نے جواب دیا ”ساتھن بیو پار میں اونچ نیچ ہوتی ہے۔ پھن پھریب ہوتا ہے۔ چھل بٹے ہوتے ہیں۔ بیو پار کی بات سن کر کیا کرے گی؟“

وجے بولی ”دیکھ میں تیری ساتھن ہوں۔ برابر کی ساتھن۔ اور ساتھی کھالی سکھ کا نہیں ہوتا۔ دکھ کا بھی ہوتا ہے۔ اونچ کا نہیں نیچ کا بھی ہوتا ہے۔ تو مجھے اپنے بیو پار کی ساری بات بتا۔ اپنے دکھ گنوا۔“

اس پر آنند نے اسے ایک لمبی چوڑی عطا طوطا مینا کہانی سنادی کہ کس طرح نگر نگر پھرا۔ راجاؤں رانیوں سے ملا۔ انہیں پھلکاری دکھائی اور انت میں اک راج ننگی پھلکاری کو دیکھ کر اس پر لٹو ہوگئی۔ بولی ”بول بیو پاری منہ مانگے دام دوں گی۔“

اس رات وجے کو یوں لگا جیسے آنند اس کا جی بہلانے کے لیے کہانی سنارہا ہو۔ سنانے کے لیے لوری دے رہا ہو۔ اس پر وہ سوچ میں کھوگئی۔ من میں گھنڈی پڑ گئی۔ بولی ”شو شو یہ تو وہ نہیں جو یہ کہے ہے۔ جو بھید ہی نہ دے وہ ساتھی کیا بنے گا۔“

”دیکھ رانی“ شوٹی بولی ”وہ اوش بھید رکھے ہے پر اس کے من میں دوج نہیں کھوٹ نہیں۔ پرش تجنی کو اپنے بیو پار کا بھید کبھی نہیں دیتا۔ وہ اسے ساری بات کبھی نہیں بتاتا۔ جرور ڈنڈی مارے ہے۔ یہی جگ کی ریت ہے۔“

”تو کیا وہ استری کو اس جوگا نہیں جانتا کہ ساری بات جانے۔ یہ تو ساتھ نہ ہوا۔ برابری نہ ہوئی۔ جاشوٹی منڈی میں جا کر پوچھ گچھ کر۔ اس کے بھید کا پتہ لگا۔“

شوٹی نے پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ آنند تو ایک راج بیو پاری ہے۔ اس نے بیجاگری کی مہارانی کے لیے شیش بھون بنوانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔

جب وجے نے یہ سنا تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ ”تو پھلکاریاں بیچ کر گیارہ کرنے کی بات ایک بہانہ تھی۔ کیوں شوشی۔۔۔۔۔ تو کیا کہتی ہے؟“

شوشی نے وجے کو بہت سمجھایا بجھایا کہ دیکھ دنیا اس سے اچھا جیون ساتھی تجھے نہیں ملے گا۔ اس سے جیادہ برابری کوئی نہ دے گا لیکن وجے نہ مانی۔ شوشا تنے پردے اوپر کچھ۔ بھیت پر کچھ۔ نہ شوشی جہاں پردے ہوں، جھوٹ ہو دکھاوا ہو، برابری کیسی۔ چل شوشی کسی ایسی جگہوں چلیں جہاں پردہ نہ ہو، جھوٹ نہ ہو۔ اب یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔“ بالاکارک گیا۔

”تو کیا وجے آنند کو چھوڑ کر چلی گئی؟“ شیشا نے پوچھا۔

”ہاں، چلی گئی۔“ بالاکا بولا

بھلا نے ایک لمبی آہ بھری۔

”پھر وجے کہاں گئی؟“ داس نے پوچھا۔

”پہلے وہ ایک پجاری کے پھندے میں پھنس گئی۔ پجاری نے اسے داسی بنالیا۔ پر بھوکی داسی۔ پھر آپ پر پھو بن بیٹھا۔ وہاں سے بھاگی تو ایک نرنگی کے جال میں جا پھنسی۔ اس نے اسے اپنے چو بارے میں سجالیا۔ چو بارے سے اسے ایک راج گائیک لے اڑا۔ وہاں سے بھی اسے برابری نہ ملی۔ گائیک سارا دن ستار سینے سے لگائے رکھتا۔ پھر تھک کر ماندگی اتارنے کے لیے وہ وجے سے دل بہلاتا۔“

”چل شوشی“ ایک دن وجے نے کہا ”یہاں تو راگ ودھیا کا راج ہے۔“

شوشی بولی ”دنیا جو چاہے ہے وہ ادھر نہیں ملے گا جہاں دھنوان بستے ہیں۔ وہ ادھر ملے گا جہاں زردھن بستے ہیں۔ کامی بستے ہیں۔ جہاں پرش پتنی کے سہارا لیے بغیر کچھ کر نہیں سکتا۔ جہاں پتنی نہ موہ ہوتی ہے نہ مایا۔ بس ایک باجو ہوتی ہے۔ پہلے سہارا ہوتی ہے پھر کچھ اور۔ جہاں دو وجے کے بنا گیارہ نہیں ہوتا۔ وہاں استری کو برابری مل جائے تو مل جائے۔“

”وہ کون سی جگہوں ہے؟ کہاں سے شوشی؟“ وجے نے پوچھا۔

”وہ جگہ وہاں ہے جہاں دھن کا جو نہیں ہوتا۔ کام کا کا ہوتا ہے۔ دیکھو دنیا تو مان نہ مان۔ پر نتو استری جیو کی دھرتی ہے۔ جس کے دم سے جیو کو نیل ہری رہتی ہے۔ استری کی سار وہی جانے ہے جو دھرتی کی سار جانے ہے۔ جو بوٹا لگانا جانے ہے جو کھیتی اگائے ہے۔ جس کا گیارہ دھرتی کی پیدا پر ہے۔ بس وہی استری کو باجو سمجھے ہے۔ اپنے سا جانے ہے۔“

و بے کے دل میں بات اتر گئی۔ ایک بار پھر وہ گھر چھوڑ کر نکل گئیں۔ شہر سے دور گاؤں کی او۔ شوشی نے و بے کو مونے پکڑے پہنا دیئے۔ منہ پر ہلدی کا لک کا ایشن مل دیا۔ بولی ”یہاں استری استری ہوتی ہے۔ گن کے جور پر نہیں۔ جیو کے جور پر۔ یہاں سندرتا شو بھانہیں رستے کی روک ہے۔ تو اپنی سندرتا کو چھپا رکھنا۔ جو نجر آگئی تو گر بڑ ہوگی۔“

”شوشی“ و بے بولی ”میں اس سندرتا کے کارن بڑا دکھی ہوں۔ کوئی بس بھری بوٹی ڈھونڈ لاکہ میں مکھ پر مل لوں جو سندرتا کی کاٹ کر دے۔“

شوشی ہنسی بولی۔ ”بھولی رانی“ سندرتا مکھ پر نہیں ہوتی۔ سارے پنڈے میں ہوتی ہے۔ انگ انگ سے پھوٹتی ہے۔ ہات ہلانے میں ہوتی ہے۔ پگ دھرنے میں ہوتی ہے۔ آنکھ اٹھانے میں ہوتی ہے۔ ہونٹ کھلنے میں ہوتی ہے۔ تو اسے اپنے سجاؤ سے کیسے نچوڑ پھینکے گی؟“

گاؤں میں پہنچ کر انہوں نے ایک جھگی میں ڈیرا کر لیا اور کھیت میں کپاہ کے پھول چننے لگیں۔

ایک دن لاکھا کسان نے و بے سے کہا تو کیسی جنانی ہے ری۔ تیری انگلیاں تو قینچی سے چلتی ہیں۔“ اس نے و بے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ انگلیاں دیکھیں تو شپٹا گیا۔ ”ری یہ کیسی انگلیاں ہیں؟ انگلیاں ہیں کہ رس بھری پھلیاں۔ اتنی لمبی اتنی پتلی۔“

پھر وہ روز اس کی چلتی چنتی انگلیاں دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے ایک دن انگلیاں پکڑ کر بولا ”ری تو میرے گھر کیوں نہیں بیٹھ جاتی۔ میں اکیلا ہوں۔ پتاجی پر ماتما کو پیارے ہو گئے۔ ماتا بہت بوڑھی ہے۔ میرا ہاتھ نہیں بنا سکتی۔ بھائی بہن ہیں نہیں۔ اکیلا ہوں۔ تو میرا باجو بن جاری۔ میں ہل چلاؤں گا تو بیچ ڈال۔ میں پانی دوں تو کھیت کی بوٹی چن۔ میں گیہوں کاٹوں تو دانے نکال۔ پھر ہم کسی سے پیٹے نہیں رہیں گے۔ میں جو آدھا ہوں پورن ہو جاؤں گا۔“ اس کی بات میں نہ موہ تھی نہ کا منا۔ نہ لو بھ۔

و بے کو اپنی شرط بھی بھول گئی۔ اس نے ہاں کر دی۔ پھر وہ دونوں کھیت پر کام میں جت گئے۔ لاکھا نا سے نزل سمجھتا نہ ماڑی۔ نہ سندرنہ دیوی۔ وہ تو اس کا باجو تھی۔ پھر کوئی بات اس سے چھپاتا بھی تو نہ تھا۔ کیسے چھپاتا۔ ہر سے وہ دونوں اکٹھے رہتے۔ کھیت میں۔ گھر میں۔ ہر بات میں اس کی مرضی پوچھتا۔ کام میں اسے ذرا چھوٹ نہ دیتا۔

و بے نہال ہو گئی۔ سمجھی جیسے جل ککڑی جو ہڑ میں آگئی ہو۔ لاکھے کسان کو و بے کی ایک بات پر بڑی چڑ تھی۔ کہتا ”ری تو گندی کو یں رہتی ہے۔ نہاتی دھوتی کیوں نہیں؟ منہ پر جردی چھائے رہتی ہے۔ الیاں بلیاں لگی رہتی ہیں۔ بال چٹ۔ آنکھوں میں کیچ۔“

و بے یہ سن کر گردن اٹکا لیتی۔

ایک دن جب وہ دونوں ندی کے کنارے کھڑے تھے تو لاکھانے تاؤ کھا کر بالٹی اٹھائی اور وجے پر انڈیل دی۔ پھر بالٹی پر بالٹی گرانے لگا۔ وجے بھاگی تو اس نے اسے پکڑ کر ندی میں چھلانگ لگا دی اور اسے یوں دھونے اور مٹانے لگا جیسے وہ رسوئی کی گڈوی ہو۔

پھر جب وہ اسے کھینچ کر پانی سے باہر لایا تو اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ سنہرے لانے بال۔ موری گردن۔ کٹورہ سی آنکھیں۔
دھاری ناک۔ پھول سے ہونٹ۔ چھوٹی موٹی سا بدن۔۔۔۔۔ ”تو کون ہے ری؟“ وہ گھگھیا کر بولا ”تواستری تو نہیں۔ تو تو پری
”ہے ری پری۔“

بالکا کچھ دیر کے لیے چپ رہا۔ پھر بولا ”بس اس دن سے لاکھے کے من میں جھجک بیٹھ گئی اور وہ وجے سے دور ہوتا گیا۔ وجے نے بار بار اسے سمجھایا۔ ”دیکھ لاکھے میں پری نہیں، استری ہوں، استری۔“ پر اس کی جھجک نہ گئی۔ بولا ”تو پری نہیں تو استری بھی نہیں۔ تو مورے میں کاگ ہوں۔ تیرا میرا کیا سمبندھ؟ کارن یہ کہ تو کامیوں میں سے ناہیں۔“

کچھ دنوں کے بعد اس کا منہ بکلتی رہی۔ پھر نرناش ہو گئی۔ پھر ایک دن وہ شوشی سے بولی ”چل شوشی یہاں ہمارا دانا پانی کھتہ ہو گیا۔“ شوشی نے سر جھکا لیا اور جوں کی توں بیٹھی رہی۔ جیسے بات سنی ہی نہ ہو۔ کچھ دیر وہ اسے دیکھتے رہی۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ شوشی اب لاٹکے کی ہو چکی تھی۔ وہ بچے کا دل دھک سے رہ گیا۔ اور وہ چپ چاپ اکیلی باہر نکل گئی۔“

بالا چپ ہو گیا۔ سبھی چپ ہو گئے تھے۔ کسی کو ”پھر کیا ہوا؟“ پوچھنے کا دھیان نہ رہا تھا۔ پھر بالکے نے کہا۔ ”پھر پتہ نہیں
----- کہتے ہیں وہ آج تک برابری کی ڈھونڈ میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ آج بھی رات کے سے راج گڑھی سے آوازیں آتی ہیں
----- پھر بھوباہر کی سندرتا کو بھیتیر میں رچادے کہ استری استری بن جائے۔۔۔۔۔ پرش کی کامنا کے ہاتھ کا کھلونا نہ رہے۔
بالا چپ ہو گیا۔ ٹیلے پر گہری خاموشی چھا گئی۔ پھر کوئی دور سے بولا۔۔۔۔۔ وجے رانی نے سچ کو پالیا۔ جو اپنی سندرتا کو
اچھالتی ہیں۔ بناؤ سنگھار کا راکش کھڑا کر لیتی ہیں، انہیں برابری مانگنے کا کوئی ادھیہ کار نہیں۔

انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ سوامی جی دوار کے باہر کھڑے تھے۔



بش اور بشرہ

آج میں آپ کو ایک لو اسٹوری سناتا ہوں۔ اس کہانی میں تین کردار پیش پیش ہیں۔ محبت کی تینوں ایک لڑکا، ایک لڑکی اور ایک ۲۵۰ طاقت کا موٹر سائیکل۔

آپ کہیں گے کہ لڑکا لڑکی تو خیر ہوئے موٹر سائیکل کو بیچ میں کیوں لے آئے۔ جناب والا میں مجبور ہوں۔ موٹر سائیکل کو میں نہیں لایا، وہ خود بخود آ گیا ہے۔ آج کل جدید گھرانوں میں موٹر سائیکل بہت ایلکٹو ہے۔ جہاں محبت کی بات سنی شراپ سے بیچ میں آگستا ہے۔ موٹر سائیکل عصری تقاضا ہے جس طرح پرانے زمانے میں وفا ہوتی تھی، جہاں محبت کی بھنک پاتی، یوں دھرنامار کر بیٹھ جاتی۔ جس طرح قرض خواہ کے دروازے پر مہاجن آ بیٹھا ہو۔ تو جناب اس کہانی میں محبت کو چلانے کی ساری ذمہ داری موٹر سائیکل پر ہے بلکہ یوں کہئے کہ اگر موٹر سائیکل نہ ہوتا تو لڑکا لڑکی جتنا زور چاہے لگا لیتے محبت پیدا ہی نہ ہوتی۔

آج کل محبت میں رفتار کو بڑی اہمیت حاصل ہے پرانے زمانے میں پہلی میں بیٹھ کر ڈھینچوں ڈھینچوں چلتی تھی۔ آج کل موٹر میں زنانے سے نکل جاتی ہے، فناک سے منزل کو جا لیتی ہے۔ بس ایک ہی مشکل ہے کہ منزل کو پہنچ کر بھی نہیں رکتی۔

ہاں تو صاحبو کہانی یوں ہے کہ.....

ایک تھی لڑکی بش اور ایک تھا لڑکا ذولف۔ بش کو ذولف سے محبت تھی۔

معافی چاہتا ہوں محبت ایک پرانا لفظ یہاں بیٹھتا نہیں۔ لیکن کیا کیا جائے کوئی اور لفظ میسر نہیں مطلب ہے کہ بش کو ذولف سے والہانہ لگاؤ تھا، انفیویشن تھی بلکہ یوں کہئے کہ ان انفیویشن اپنی شدت کی وجہ سے مجبوری بن چکی تھی۔ یہ مجبوری بش کے گلے میں خواہ مخواہ پڑ گئی تھی، ساری شرارت موٹر سائیکل کی تھی۔

ہوایوں کہ ایک دن جب وہ گھر کی ٹیرس پر کھڑی تھی تو دفعتاً ایک شوراٹھا، بھونچال سا آ گیا۔ الماریوں میں رکھے ہوئے برتن بچنے لگے۔ میزوں پر گلدان جھوٹے۔ ٹی وی کا ایریل تھرایا۔ اسلام آباد کی سڑک نما گلی گزرا ہٹ سے بھر گئی اور آخر کو کوئی چیز زوں سے گلی سے یوں گزر گئی جیسے ہوائی چل گئی ہو۔

یہ ہوائی ذولف کا موٹر سائیکل تھا۔

بش دیکھتی..... کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

دل اچھل کر باہر نکل آیا۔ جسم گویا سکتے میں رہ گیا۔

ہائے اتنی تیزی..... اتنی تڑپ جیسے بجلی گری ہو۔ پھر اسے پتہ چلا کہ یہ بجلی ہر روز شام کے پانچ بجے گلی پر گرتی ہے اس لیے وہ روز پانچ بجے اس کا انتظار کھینچنے لگی۔

جب ذولف گلی میں زوں سے نکل جاتا تو بش کو دکھتا دکھایا کچھ نہ تھا، صرف موٹر سائیکل کی ایک سرخ سی لکیر اور ہیلمٹ کا ایک سلیٹی دھبہ۔

تو جناب بش کو اس سرخ اور سلیٹی دھبے سے محبت ہو گئی۔ جب بھی سرخ لکیر اور سلیٹی دھبہ زنائے سے گزرتے۔ اس کا دل اچھل کر باہر آ جاتا اور جسم میں سوئیاں چبھنے لگتیں۔

در اصل بش کو رفتار سے عشق تھا۔ پتہ نہیں کیوں شاید عصری تقاضا ہو یا شاید ذہن میں کوئی غم و دوا اند لگ گیا ہو جیسے پائلٹوں میں یا موٹر ریسروں میں ہوتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے بش میں ایک بے نام اضطراب بھی تھا۔ جو اس کے بند بند کو جھلاتا رہتا تھا۔

اول تو وہ ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتی تھی۔ ابھی یہاں بیٹھی تھی۔ اب وہاں کھڑی گنگنا رہی ہے لووہ ٹیرس پر ٹھلنے لگی۔ یہاں سے وہاں جا بیٹھنے کے لیے اسے اڑانے کی چنداں ضرورت نہ پڑتی تھی۔ بیٹھتی تو جسم کا رواں رواں دھنکی کی طرح بچتا۔ اور کچھ نہیں تو پاؤں چلتا۔ چلے جاتا اتنی تیزی سے جیسے اندھ پھینٹتے ہوئے چچھو چلتا ہے۔ مختصر یہ کہ بش بڑی ہی بے تاب روح تھی۔

جو کام ذہن میں آتا، چاہتی کہ ابھی ہو جائے۔ ابھی اسی وقت جھٹ پٹ خیال ذہن میں اس قدر تیزی سے آتے کہ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے جیسے تصویر ملٹی ایکسپوژر کی وجہ سے دھندلی ہو جائے۔

مثلاً نام ہی کو لیجئے۔

اس کا نام بشرہ تھا، جو اسے پسند نہ تھا۔

توبہ اتنا لمبا نام..... بش..... را، اونہوں۔ نام ایسا ہو جو چھوٹا ہو، تر ت ہو، خستہ ہو، کڑا کے دار ہو۔ اسی وجہ سے اس نے نام کو کاٹ کر بش رکھ لیا تھا۔ بش کے صوتی اثر میں تیزی تھی اور پھر جھکا بھی اور معنوی طور پر بھی وہ..... لیکن چھوڑیے بش کو معنوی پہلو سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اس نے ذوالفقار کو بھی ذولف کہنا شروع کر دیا تھا۔ اتنا لمبا نام ذوالفقار..... توبہ ڈریگ کرتا ہے۔

اگرچہ بش روز ذولف کا انتظار کرتی تھی تاکہ گزرتے ہوئے اسے دیکھے۔ لیکن اس نے ذولف کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیسے دیکھتی! قیام کے عالم میں ہوتا تو دیکھتی اور اگر ذولف قیام کے عالم میں ہوتا تو وہ ایک عام سالڑ کا بن کر رہ جاتا۔ سارا روٹھ تو سپینڈ نے پیدا کر رکھا تھا۔

بش کو تو یہ بھی علم نہ تھا کہ ذولف کے خدو خال کیسے ہیں۔ لیکن ہٹائے محبت میں آج کل خدو خال کون دیکھتا ہے۔

بش کو ذولف سے اس لیے محبت نہ تھی کہ وہ ذولف تھا بلکہ اس لیے کہ وہ جدیدیت کا سہل تھا۔ اور جدیدیت سے اسے عشق تھا عشق۔ اس کی نظر میں ہر چیز ہر بات جو دور جدید کی نشاندہی کرتی تھی۔ اس قابل تھی کہ خود کو اس پر نثار کر دیا جائے اور ذولف میں جدیدیت کی ایک نہیں تین باتیں تھیں۔ ایک تو وہ رفتار کا دیوانہ تھا۔ حرکت اس لیے زندگی تھی اور قیام موت پھر وہ اضطراب کا بادشاہ تھا۔ اضطراب بھی تو حرکت ہی ہوتی ہے۔ گرداب زدہ حرکت۔ بس ذرا رنگ مختلف ہوتا ہے۔ تیسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ نتائج سے بے پرواہ تھا۔ بے نیاز تھا۔ یوں کیا تو یہ ہو جائے گا کہیں وہ نہ ہو جائے۔ پڑا ہو۔ جو ہو سو ہو۔ ٹوہل و دواٹ۔

ذولف ایک کھاتے پیتے بنے سچے گھر کا فرزند تھا۔ باپ ایک اعلیٰ افسر تھا۔ ماں سوشل سرکلو کی جان تھا۔ گھر کی فضا لوٹ لو کے جذبے سے اس حد تک بھری ہوئی تھی کہ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ وہ گھر نہیں بلکہ بے تعلقی کی جنت تھا۔ پھر بھی کبھی کبھار ماں باپ کی بچوں سے ملاقات ہو ہی جاتی اور انہیں احساس ہوتا کہ وہ ان کے اپنے بچے ہیں۔ سوشل ماں کے لیے یہ احساس بہت تکلیف دہ ہوتا ہے خصوصاً جب بچے جوان ہو جائیں تو۔ وہ ماں کی عمر کی گواہی جو دینے لگتے ہیں اور آپ جانتے کہ سوشل ماں کے لیے عمر کا مسئلہ بڑا نازک ہوتا ہے، بہر صورت ذولف کی ماں اس بات پر بہت خوش تھی کہ بیٹے نے موٹر سائیکل رائیڈنگ کی ہابی کو اپنا رکھا ہے اور شا میں گھر میں نہیں بلکہ سڑک پر گزرتا ہے۔ باپ بھی خوش تھا کہ بیٹے میں ڈیش ہے اور جب وہ کیریئر کے سائیکل پر چڑھے گا تو کچھ کر دکھائے گا۔

دراصل ماں باپ دونوں ہی آزاد خیال تھے اور اپنے لبرلٹڈ ہونے پر فخر محسوس کیا کرتے تھے۔ ان کے دلوں میں صرف دو بندھن باقی رہ گئے تھے۔ اسٹیٹس اور کیریئر۔ شاید یہ بندھن لبرلٹڈ ہونے کے لیے از بس ضروری ہوتے ہیں۔ ذولف کو بچپن ہی سے رفتار سے عشق تھا اور یہ عشق اتنا شدید تھا کہ مزید کسی عشق کی گنجائش نہ رہی تھی۔

وہ صبح انسٹی ٹیوٹ میں حاضری دیتا جہاں وہ مینجمنٹ کورس کے آخری دور میں تھا۔ پھر شام کو پانچ بجے موٹر سائیکل رائیڈنگ پر نکل جاتا۔ ایکسپریڈر دباتا اور دباتا۔ حتیٰ کہ موٹر سائیکل ہوا میں تیرنے لگتا۔ بس یہی اس کی جنت تھی۔ سات آٹھ روز تو بش میرس پر کھڑی

ہو کر ذولف کی زوئیں سنتی رہی، دیکھتی رہی، سن سن کر نہال ہوتی رہی۔ پھر وہ مضطرب ہو گئی۔ یوں جیسے شیر پنجرے میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ٹہل لاتا ہے۔ مقصد نہ ادھر آنا ہوتا ہے نہ ادھر جانا، ذولف کی زوئیں بش کے دل میں اک زوئیں چلا دیتی۔ وہ زوئیں اس کے بند بند میں گونجتی۔

بش کے دل میں وصال کے لیے تڑپ پیدا نہ ہوتی تھی۔ جس طرح پرانے زمانے کے عشق میں پیدا ہوا کرتی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ بش کے ذہن میں وصال کا تخیل سرے سے وجود ہی نہ رکھتا تھا کہ وہ کیا ہوتا ہے۔ کوئی کیفیت ہے یا منزل، اس کے دل میں یہ آرزو بھی نہیں تھی کہ ذولف آنکھوں کے سامنے رہے اور میں اسے دیکھتی رہوں۔ نگاہوں کے سامنے رہنے یا اسے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا چونکہ سامنے رہنا تو قیام کی صورت ہے اور قیام تو اس کے نزدیک بوریات تھا۔ رہا دیکھنے کا سوال تو اگر آپ کے سر پر ہیلمٹ سوار ہو، منہ پر پلاسٹک کا چھجہ چڑھا ہو، جسم پر چمڑے کا جیکٹ ہو، ہاتھوں پر دستاں ہوں تو دیکھنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

ذولف کی زوئیں دیکھ کر بش کے دل میں صرف ایک آرزو پیدا ہوتی تھی کہ اس لال لکیر اور سلیٹی دھبے کے ساتھ اس کے اپنے بال بھی ہوا میں لہرائیں وہ بھی اس متحرک تصویر کا ایک حصہ بن جائے، اگر وہ پرانے دور کی یا پابند گھرانے کی لڑکی ہوتی تو بیٹھ کر آہیں بھرتی یا دل بہلانے کے لیے فلمی گانے سنتی لیکن بش تو جدید گھرانے کی پیداوار تھی۔ گھر والے لڑکی پر نظر رکھنے کے قابل نہ تھے۔ اڑوس پڑوس والے ذاتی معاملے کو کچھ زیادہ ہی ذاتی سمجھتے تھے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔

ان حالات میں بات چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس لیے بش نے شام کے پانچ بجے کی اس لذت میں چھوٹی بہن کو بھی شریک کر لیا۔ چھوٹی بہن سے بات میم تک پہنچی۔ می نے بھلا کیا کہنا تھا، مسکرا کر چپ ہو رہی۔

لہذا ایک شام بش میس کی بجائے گلی میں جا کھڑی ہوئی۔ ذولف آیا تو اس نے انگڑائی کی صورت دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔ رکنے کا اشارہ کیا۔

ذولف نے موٹر سائیکل روک لیا۔

اے لفٹ پلیز..... وہ بولی۔

اوکے جپ آن۔

وہ اچھل کر بیک سیٹ پر جا بیٹھی۔ موٹر سائیکل چل پڑا۔ اگر وہ روایتی ماحول میں پلے ہوتے اور وہ کسی نوجوان کے موٹر سائیکل کی بیک سیٹ پر بیٹھ جاتی تو مشکل پڑ جاتی۔ نوجوان کے لیے سورج سوانیزے پر آ نکلتا۔ پھر پسینہ ہی پسینہ کنفیوژن، ہی کنفیوژن، ذہن میں

بریک اور ایکسلریٹر گنڈا ہو جاتے۔ لیکن ذولف کو کچھ بھی نہ ہوا۔ جیسے پیچھے بھس کی بوری بھری ہو۔

البتہ اس نے سپیڈ سلو کر دی کہ بوری گر نہ جائے۔

سلو کیوں ہو گئے۔ وہ چلائی۔

سڑک بچی ہے۔ وہ بولا۔

پڑی ہو۔

گر جائے گی۔

سو واٹ؟

ذولف کو بات سمجھ میں آ گئی کہ اسے کہیں جانا نہیں، پہنچنا نہیں..... صرف جائے رائیڈ ہے۔ ذولف نے ایکسلریٹر کھول دیا۔ موٹر سائیکل ہوا میں تیرنے لگا۔

پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ ذولف آ کر رک جاتا، ہوٹ بجاتا۔ بش دوڑ کر آتی، اچھل کر بیک سیٹ پر چڑھ جاتی۔ ذولف ایکسلریٹر کھولتا، کھولے جاتا اور موٹر سائیکل ہوا میں اڑے جاتا۔

ٹریفک پولیس ذولف سے واقف تھی۔ جب ذولف گزرتا تو چوک کا سپاہی منہ موڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ ہم نہیں دیکھ رہے کی صورت۔ ابتدائی ایام میں جب وہ ذولف سے آشنا نہ تھے تو سپاہی لپک کر آگے بڑھتا تھا۔ سیٹی بجا کر اسے روکا تھا۔ پھر تحکمانہ شان سے جیب سے کاپی پنسل نکالے تھے اور حسب دستور فرعونی لہجے میں پوچھا تھا کیا نام ہے تیرا؟ باپ کا نام؟ کیا کرتے ہیں وہ؟ جواب سن کر سپاہی کا کلف اتر گیا تھا۔ گردن جھک گئی تھی اور کاپی پنسل دوبارہ جیب میں جا چھپی تھی۔ اس روز کے بعد وہ ذولف کو پہچاننے لگے تھے۔ یوں کہ جب بھی وہ گزرتا سپاہی منہ موڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ ہم نہیں دیکھ رہے کی صورت۔

چار ایک دن تو بش بیک سیٹ پر سٹریپ سے چمٹی رہی۔ پھر جو ایک زور جمپ لگا تو اس نے چیخ مار کر اپنی بانہیں ذولف کے گرد حائل کر دیں۔ ذولف کو پھر بھی کچھ نہ ہوا، البتہ بش کو ہوا۔ کچھ کچھ۔ اور اس کی بانہیں ذولف کا سہارا لینے کی عادی ہو گئیں۔

پھر وہ بانہیں گھسیٹ کر اسے اپنے گھر میں لے گئی۔ می ڈیڈی سے تعارف ہوا۔ یوں دونوں کنبے ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ جدید گھرانوں میں یہ عیب ہے کہ وہاں لو اسٹوری جنم لینے میں تو بڑی بے تاب ہوتی ہے مگر پھلتی پھولتی نہیں یا شاید محبت میں یہ عیب ہے کہ پابندیاں نہ ہوں تو وہ چلتی نہیں۔ ختم ہو جاتی ہے، صرف اسٹوری باقی رہ جاتی ہے اور یا وہ افیر بن کر اپنی عظمت کھودیتی

ہے۔ محبت میں انسان کے لیے محرومی لازم ہے۔ محرومی شامل ہو جائے تو محبت عشق بن جاتی ہے۔ عشق انسان کو مادی دنیا کی گرفت سے نکال کر نہ جانے کہاں لے اڑتا ہے۔

بش اور ذولف کی دنیا میں پابندیاں نہیں تھیں رکاوٹوں کا وجود نہ تھا۔ دونوں گھرانوں کے ہاں اسٹیشن بھی تھا اور کیرئیر کے مواقع بھی۔ لہذا بش نے می کے ذریعے بات چلائی ذولف کے گھر والوں نے پیغام بھجوادیا جو منظور کر لیا گیا اور وہ ایک دوسرے سے منسوب ہو گئے۔

مگنی سے ان کی زندگی میں کوئی فرق نہ پڑا۔ نہ خوشی کا احساس تھا نہ پالینے کا۔ پالینے کی کوشش تو جیسی ہوتی ہے جب پالینے میں دشواریاں حائل ہوں یہ عشق بھی عجب عشق تھا۔ ذولف حرکت کا دیوانہ تھا اور بش متحرک کی مداح تھی۔ وہ تماشا تھا یہ تماشا ہی تھی۔ تماشے کو تماشا کی سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔

اگر ان تینوں کرداروں تک محدود رہتی تو یہ کہانی شادی پر شہنائی کے ساتھ ختم ہو جاتی اور اس کے بعد دونوں روٹین زندگی بسر کرنے لگتے۔ اور کہانی سننے والے ناک چڑھا کر کہتے یہ کہانی تو بالکل سطحی ہے۔ کھوکھلی بے لذت بے جان۔ اس میں تو زندگی کا زیرو بم ہی نہیں۔ صرف زیر ہی زیر بم کا نشان نہیں ملتا۔

وہ تو محض اتفاق کی بات تھی کہ چوتھے کردار نے غیر متوقع طور پر آ سر نکالا اور اسے کہانی بنا دیا۔ ہوا یوں کہ ایک شام جب وہ گول چوک کے قریب پہنچے تو وہ رک گیا۔ بش اتر گئی۔ ذولف نے موٹر سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کر دیا۔ اور پھر گول چوک سے ملحقہ پارک کی طرف چل پڑا۔ بش حیران تھی کہ بات کیا ہے۔

دفعۃً ذولف بولا۔ ”بش وی آر ڈونگ اٹ“

”ڈونگ واٹ؟“ وہ چلائی۔

”کراچی گلگت نان اسٹاپ ریس“ اس نے جواب دیا۔

جب بش کو بات سمجھ میں آئی تو خوشی سے اس کے بدن پر چیونٹے دوڑنے لگے۔

”کیا میں بھی ساتھ ہوں گی؟“ بش نے پوچھا۔

”سیکنڈ مین کے بغیر یہ ریس ہو ہی نہیں سکتی۔“

بش کی باچھیں کھل گئیں۔

تمہیں پریکٹس کرنی پڑے گی۔

پریکٹس..... کیسی پریکٹس۔

سیکنڈ مین بننے کی پریکٹس۔ موٹر سائیکل کی پوری مکینک سیکھنی پڑے گی۔ پہیہ بدلنا، پنچر لگانا، چلتے چلتے تیل بھرنا، الیکٹرک وائرنگ کو سمجھنا، پلگ صاف کرنا، بدلنا، سیکنڈ مین کا کام بہت رف ہوتا ہے۔

بش تن کر کھڑی ہو گئی۔ ”آئی ول“

”شور“ اس نے پوچھا۔

”شورایزدی من شانز“

”اٹ ازاے چیلنج“

”آئی ٹیک اٹ“ وہ دانت بھیج کر بولی۔

”یہ سلک سٹف نہیں چلے گا۔“ ذولف نے اس کے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”اے ورک مین کٹ، سپکس ہیلمٹ گلووز“

کبھی کچھ

اوکے

ٹھیک۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کل سے ٹریننگ شروع۔

ابھی وہ موٹر سائیکل کے قریب پہنچے تھے کہ گول چوک سے ایک شور سنائی دیا۔ ایک ٹرک راگیئر کو کچل کر بھاگا آ رہا تھا۔ چوک کا سپاہی روکنے کے لیے سیٹیاں مار رہا تھا۔ آس پاس کے لوگ چلا رہے تھے۔

روکو، روکو، پکڑو۔

یہ منظر دیکھ کر ذولف پر وحشت سوار ہو گئی۔ ایک ہی جست میں وہ موٹر سائیکل پر سوار ہو گیا اور ٹرک کے پیچھے ہوا ہو گیا۔ کچھ دیر دونوں کے درمیان ریس ہوتی رہی لیکن ذولف بجلی کی طرح آگے نکل گیا اور ٹرک کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک دھماکہ ہوا اور ٹرک درخت سے ٹکرا کر لڑھکتا ہوا نچان میں جا گرا۔ بش نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا دل ڈوب گیا۔

ذولف کو اٹھا کر ہسپتال میں لے گئے۔ دودن امید و بیم کا آرا چلتا رہا۔ آخر امید غالب آئی۔ ذولف بچ گیا لیکن اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی گئیں۔ اس پر چند ایک روز تو بش یوں ادھ موٹی پڑی رہی جیسے اس کی دنیا ہی لٹ گئی ہو۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے اندر

کا ”سوداٹ“ بیدار ہوا۔

سہیلیوں نے اسے سمجھایا۔ ایک بولی۔ ”زوں سے لگن لگاؤ گی تو زنا ناتا ہوگا۔“

دوسری بولی۔ ”مری کیوں جاتی ہے زوں تو ختم نہیں ہوا۔ سڑک پر بڑا بڑا زوں پڑا ہے ابھی۔“

تیسری نے کہا۔ ”مگلیتر کا غم کھاتی ہے کیا۔ مگلی کو بھول جا۔ تیرے گھر والے اب کوئی اور مگلیتر ڈھونڈیں گے۔“

چوتھی بولی۔ ”لفٹ کا کیا ہے جس سے مرضی ہے مانگ لے۔ جس سے مانگے گی وہ پھولے نہیں سمائے گا۔“

ان باتوں کے باوجود وہ روز ہسپتال جاتی رہی۔ دو مہینے گزر گئے۔ اس کی اس باقاعدگی کو دیکھ کر می ڈیٹی گھبرا گئے۔ ایک روز

ہسپتال جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ می نے اسے آواز دی۔ بش ذرا ادھر آنا۔

جب وہ می کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ ڈیٹی بھی وہیں بیٹھے پائپ پی رہے ہیں۔

”بش!“ می نے کہا۔ ”تو کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہے؟“

”میں نہیں سمجھی می“ وہ بولی۔

”بھئی ہسپتال کی فضا بھی ڈیپرینگ ہوتی ہے ذہن پر برا اثر کرتی ہے۔“ ڈیٹی نے کہا۔

”اگر جانا ضروری ہے تو ہفتے میں ایک دفعہ ہو آ یا کر۔“ می بولی۔

”بش“ ڈیٹی نے کہا۔ ”اب اس Attachment کو ختم کر دینا چاہیے۔ تو ایک سمجھدار لڑکی ہے۔ ایک معذور کے ساتھ زندگی بسر

نہیں ہو سکتی۔“

”وہ تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ می بولی۔

”ہاں فارگٹ اٹ“ ڈیٹی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”تو کیا کہتی ہے بش؟“

”ٹھیک ہے۔“ وہ بولی۔ ”ساری عمر میں وہیل چیئر سے تو بندھی نہیں رہ سکتی۔“ بش کا حلق بند ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”سمجھدار لڑکی ہے۔“ ڈیٹی نے بش کو تھپکتے ہوئے کہا۔

”ڈیٹی آج تو مجھے جانا ہی ہوگا البتہ کل.....“ بش رک گئی۔

”ضرور ضرور“ ڈیٹی نے جواب دیا۔

”بلکہ اچھا ہے“ ممی بولی۔ ”آج خدا حافظ کراؤ۔“

اس شام جب وہ ذولف کے پاس پہنچی تو وہ بڑی حسرت سے پورٹیکو میں کھڑے موٹر سائیکل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ برآمدے کے سامنے پلاٹ میں وہ وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔

”ہیلو“ وہ بولی۔

ذولف چونکا اس نے نگاہ اٹھائی..... ”اوہ ہش“

”آج اکیلے بیٹھے ہو۔“

”ہوں“

”گھر والے نہیں آئے؟“

”کوئی Engagement ہوگی۔ صرف تم ہی روزانہ آتی ہو۔“

”اچھا“ اس نے حیرت سے کہا۔

”کل سے شاید تم بھی نہ آؤ۔“ وہ بولا۔

”کیوں؟“

”کل میں گھر جا رہا ہوں۔“

”کیا واقعی؟“

”ہاں بیساکھیاں آگئی ہیں۔“

”کہاں ہیں؟“

”اندر پڑی ہیں۔“

”ہوں“ وہ چپ ہو گئی۔ دیر تک وہ دونوں چپ بیٹھے رہے۔

”ذولف“ ہش بولی۔ ”آرٹیفشل لمبر نہیں لگتے کیا؟“

”لگتے ہیں“ اس نے جواب دیا۔ ”صرف دکھنے دکھانے کے لیے لگتے ہیں ویسے نہیں۔“

”اوہ“ وہ آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ پھر بولی۔ ”ناگئیں تو ٹھیک ہو گئی نا؟“

”ہاں ناگئیں تو ٹھیک ہیں لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ اس نے پوچھا۔

دی لگژر آل رائیٹ۔ وہ بولا۔ ”بٹ ایوری تھنگ اباؤٹ دم شل نیور بھی آل رائٹ“ وہ پھر خاموش ہو گئی۔ دل پر بوجھ پڑ گیا۔ اس نے خود کو جھنجھوڑا۔ مجھے اب جانا چاہیے۔

”ہاں“ وہ بولا۔ ”تمہیں جانا ہی پڑے گا۔ کب تک اپنا جج کے ساتھ بندھی رہو گی۔“

بش کو ایک چکر سا آیا۔ لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔ ”خدا حافظ“ وہ بولی۔

راستے میں وہ سوچتی رہی۔ کچھ کہتا تھا اپنا جج سے کون بندھا رہے۔ ڈیڈی بھی ٹھیک کہتے ہیں اس دلدل سے بچ نکلنا لازم ہے۔

میری سہیلیاں نوم، بیدہ، پوپو، سب میرا مذاق اڑاتی ہیں۔

چلو اچھا ہوا۔ آج خدا حافظ کہہ دیا۔

جب وہ گھر پہنچی تو بہت خوش تھی۔

گھر والوں نے اسے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔

اس رات بش بڑے اطمینان کی نیند سوئی لیکن پتہ نہیں آدھی رات کو کیا ہوا، گویا کسی نے اسے جگا دیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھی۔ کمرہ کسی موجودگی سے بھرا ہوا تھا۔ اور وہ موجودگی گویا بہت ہی مانوس موجودگی تھی۔

اس کے ذہن میں ایک احساس ابھرا۔ یوں جیسے ہفتوں بھولی ہوئی بات یکلخت ذہن میں ابھر آتی ہے۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ ذولف کے پیچھے ہوا میں تیر رہی ہو۔ موٹر سائیکل گھاؤں گھاؤں کر رہا تھا۔ پھر وہ گھاؤں گھاؤں مدھم پڑتی گئی۔ حتیٰ کہ خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں ہوا میں تیرتے ہوئے جا رہے تھے۔ موٹر سائیکل کا نشان باقی نہ رہا تھا۔

پتہ نہیں کیا ہوا۔ ذولف کی ذات ابھری، ابھرتی چلی گئی۔ سارا کمرہ ذولف کے پسینے کی خوشبو سے بھر گیا۔

بش گھبرا گئی۔ اس موجودگی کے احساس سے گھبرا گئی۔ وہ موجودگی اس کے اندر سے یوں نکل رہی تھی جیسے اس میں ایک عظیم تبدیلی رونما ہو رہی ہو۔ جیسے سنڈی قتل بنی جا رہی ہو۔ جیسے لڑکی عورت میں بدل رہی ہو۔

بش پھیل رہی تھی۔ بھاری درخت بنتی جا رہی تھی۔ اس کے دل میں وسعتیں ابھر رہی تھیں۔ اتھاہ گہرائیاں اگلڑائیاں لے رہی تھیں جسم حیات سے لت پت ہوا جا رہا تھا۔ حیات میں رشتوں کے بندھن ابھر رہے تھے۔ اس کی بائیں ذولف کے گرد یوں

پیوست ہو گئی تھیں جیسے نیل بوٹے کے ارد گرد بل کھا کر لپٹ جاتی ہے۔ ذولف کا ہیلمٹ سر سے گر گیا تھا۔ جیکٹ تارتار ہو گیا تھا۔ آنکھوں پر چڑھے ہوئے پلاسٹک کے چھجے ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔ اس کی ذات تنگی ہو گئی تھی اور ذات کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک اٹھا تھا۔

اگلے روز وہ بے دھڑک ڈیڈی کے کمرے میں داخل ہوئی بولی۔ ”ڈیڈی میں نے فیصلہ کر لیا ہے‘ میں ذولف سے اپنی Engagement نہیں توڑوں گی۔“

باپ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں ذولف سے شادی کروں گی۔“ وہ بولی۔

”لیکن بیٹی.....“ باپ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”ہی نیڈر می ڈیڈ“ وہ بولی۔

”بٹ ڈویو نیڈ ہم؟“ باپ نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ”آئی ڈو آئی ایم ہر تھرو اینڈ تھرواٹ ازاے لینڈ آف نور یٹرن۔“

ڈیڈی نے چونک کر بش کی طرف دیکھا۔ اس کے سامنے بش نہیں بشرہ کھڑی تھی۔



۵۵

یہ کون آن گھسا ہے میرے گھر میں بن بلائے بن پوچھے۔ بن بتائے۔ کیوں؟

یہ کیسی موجودگی ہے۔ میرا سارا گھر اس سے بھرا ہوا ہے۔ وہ ہر کمرے میں بیٹھا ہے۔ سیدھیوں میں صحن میں برآمدوں میں باورچی خانے میں۔ ہر جگہ۔ ہر وقت دن ہو یا رات صبح ہو یا شام۔ میرا گھر مجھ سے اس قدر بھرا ہوا نہیں جس قدر اس سے بھرا ہوا ہے۔

کیا مصیبت ہے زندگی میں پہلی بار میں دوکیلا ہوا ہوں۔ میں جوازی طور پر اکیلا تھا۔

بچپن میں بھرے گھر میں اکیلا تھا۔ چلا جاتا تو کسی کو پتہ نہ چلتا کہ چلا گیا ہوں۔ آ جاتا تو کوئی محسوس نہ کرتا کہ آ گیا ہوں۔

جوانی میں اپنا اکیلا پن دور کرنے کے لیے میں نے ایک عورت سے محبت لگالی۔ اپنا سبھی کچھ دے کر خود ہی اس کی دہلیز پر بیٹھ گیا۔ لٹ پٹ گیا تو پتہ چلا کہ اکیلا پن اور بھی گہرا ہو گیا ہے جرات ہوتی تو دہلیز سے اٹھ جاتا۔ لیکن ایک بار بیٹھ کر اٹھ جانا میری سرشت میں نہ تھا۔ نہیں ہے۔ لہذا اٹھنے کی جرات نہ ہوئی۔ اس لیے بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا۔ سولہ سال بیت گئے۔ حتیٰ کہ لٹے پٹے اور اکیلے رہنے کی لت پڑ گئی۔ پھر وہ اپنا گھر چھوڑ کر میرے گھر میں آ گئی۔ میری ہو گئی اور میں اپنے گھر کی دہلیز پر آ بیٹھا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ بولی۔ ”اب میں تیری ہوں۔“

”ہاں“ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔ کتنی خوشی کی بات ہے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی دیکھتی رہی۔ میں خوشی کے نشے میں چور اسے دیکھتا رہا دیکھتا رہا۔

”تو مجھے دیکھ رہا ہے۔“ وہ بولی۔

”اور میرا کام ہی کیا ہے؟“

”میں یہاں ہوں یہاں تیرے پاس۔“

”ہاں تو میرے سامنے ہے۔“

”لیکن تو اب بھی دہلیز پر بیٹھا ہے۔“

”اور کہاں بیٹھوں؟“

”قریب آ جا“

”قریب آ گیا تو مجھے نظر کیسے آئے گی؟“

”پتہ ہے تیری جگہ کون سی ہے۔“ اس نے اپنی گود پھیلا دی۔

”وہی جہاں میں بیٹھا ہوں۔“ میں نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

پھر آہستہ آہستہ وہ بند ہوتی گئیں۔ بند ہوتی گئیں۔ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔ اور میں پھر سے اکیلا رہ گیا۔

پھر لوگوں نے زبردستی پکڑ کر میری شادی کر دی۔ جب میں نے پہلی بار اپنی بیوی کو دیکھا تو مجھے پتہ چل گیا کہ وہ بھی مجھ ایسی ہے۔ لٹی پٹی اکیلی۔

اس نے سات سال اپنے پہلے دولہا کے انتظار میں دہلیز پر بیٹھ کر گزار دیئے تھے۔

ہمارا آپس میں ان کہا سمجھوتہ ہو گیا۔ اور ہم دونوں دو کیلے میں اکیلے اکیلے رہنے لگے۔

ہاں میں تو ازیں طور پر اکیلا ہوں اب یہ کون آ گیا ہے میرے گھر میں کیوں دھرنا مار کر بیٹھ گیا ہے۔ یہاں آخر..... وجہ

..... مطلب؟

ویسے دیکھنے میں آج بھی میں اکیلا دکھتا ہوں۔ کسی کو خبر نہیں کہ گھر میں کوئی آ گیا ہے۔ میری بیوی کو بھی پتہ نہیں۔ صرف میں جانتا

ہوں کہ میں اکیلا نہیں رہا۔ وہ آ گیا ہے۔ اور میرا گھر اس سے یوں بھر گیا ہے جیسے ماں کا سارا وجود ہونے والے بچے سے بھر جاتا

ہے۔

صاحبو مجھے پتہ نہیں کہ وہ کون ہے صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ ہے۔ کیوں؟ کس لیے اس نے میرے اکیلے پن کی مسند کو یوں تار

تار کر دیا ہے۔ مجھے علم نہیں صرف دکھ ہے۔ اپنے اکیلے پن کو کھودینے کا دکھ۔

زندگی میں میں نے ایک ہی امتیاز حاصل کیا تھا۔

زندگی کرنے کا ایک ہی طریقہ سیکھا تھا۔

اکیلے پن نے مجھے بڑا اعزاز بخشا تھا، مقام بخشا تھا۔

مجھے بت بنا دیا تھا۔ بہت بڑا بت۔

صاحبو! کیلا پن بہت بڑا بت گر ہے۔

زندگی بھر میں بت بنا رہا۔

بت کا مطالبہ ہے کہ کوئی پجاری ہو۔ نہ ملے تو وہ خود اپنا پجاری بن جاتا ہے۔ زندگی بھر میں خود کی پوجا کرتا رہا۔ اس لیے کہ نہیں کہ جھکنا سیکھوں بلکہ اس لیے کہ بت کی شان قائم رہے لیکن جب سے وہ آیا ہے۔ بت ترخ رہا ہے، ٹوٹ رہا ہے ریزہ ریزہ ہوا جا رہا ہے۔ میری ساری زندگی کی کمائی میری آنکھوں کے سامنے لٹی جا رہی ہے۔

سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بے نام موجودگی نے اتنے بڑے بت کو کیسے توڑ دیا۔ اس کے ہاتھوں میں تیشہ نہیں کلہاڑا نہیں کدال نہیں کچھ بھی تو نہیں۔ اس کے انداز میں تشدد نہیں طیش نہیں غصہ نہیں پھر یہ کیسے ہوا۔

بتوں کو توڑنے کے لیے غزنوی پیدا ہوتے ہیں، حملے کئے جاتے ہیں۔ ایک دو نہیں، سولہ سترہ۔ فوجیں چڑھائی کرتی ہیں۔ تہس نہس کرتی ہیں۔ یوں تو کبھی نہیں ہوتا کہ ایک بے نام ان جاننا وہ چپکے سے آئے دھرنا مار کر بیٹھ جائے اور اس کی موجودگی سے بت خود بخود ترخنے لگے۔

کبھی کبھی مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ وہی تو نہیں جس کا نام لے لے کر چھپنے میں بڑے بوڑھے مجھے ڈرایا کرتے تھے۔ جس سے ڈر ڈر کر میں جوان ہوا تھا۔ پھر جوانی میں دانشوروں سے ملا تو ہم مل کر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ دراصل بچپن میں اس سے ڈر ڈر کر اب ہم اس سے انتقام لے رہے تھے۔

پھر ادھیڑ عمر میں میں اس سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ ہے تو پڑا ہو۔ نہیں ہے تو نہ سہی کیا فرق پڑتا ہے لیکن نہیں یہ وہ نہیں ہو سکتا۔ وہ تو بہت ڈراؤنا تھا۔ اس نے آگ کی ایک بہت بڑی بھٹی جلا رکھی تھی۔ ہاتھ میں سونٹا تھا۔ سونٹا چلاتا۔ لوگوں کو دھڑا دھڑا آگ میں ڈالتا جاتا۔ بس یہی اس کا کام تھا۔

پھر جوانی میں علم کے ساتھ ساتھ اس کی عظمت اجاگر ہوئی۔ عظمت ہی عظمت، عظمت ہی عظمت۔ ڈر اور خوف کی جگہ حیرت نے جنم لیا۔ نہیں یہ وہ بھی نہیں۔ یہ موجودگی نہ تو ڈراؤنی ہے نہ حیرت کا جذبہ طاری کرتی ہے۔ یہ تو ایسے ہے جیسے لگن اور لگاؤ سے بھیگی ہوئی اک فضا ہو۔ یوں لگتا ہے جیسے ماں کی کوکھ نے پھیل کر میرے گھر کو سمیٹ لیا ہو۔ ایک ”نگ“ ہے جو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ ایک عجیب سا سکون۔ لطافت کا ایک ٹھہراؤ۔

مجھ پر خواہ مخواہ ایک احساس مسلط ہوا جا رہا ہے۔ جیسے میں نے پالیا ہے۔ کیا پالیا ہے۔ انہوں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ بس پالیا ہے۔ جیسے سب کچھ پالیا ہے۔ میں نے کبھی اس کی آرزو نہیں کی تھی۔ اس کے لیے ڈھونڈ نہیں کی تھی۔ اسے پانے کی آرزو نہ کی تھی۔ کبھی اسے چاہا نہ تھا، کتنی عجیب بات ہے کہ ڈھونڈے بغیر پا لو۔ جانے بغیر جان لو۔

پہلی مرتبہ جب میں نے اس کی موجودگی کو محسوس کیا تو میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔ ان دنوں میں سخت فکر مند تھا۔ بے چین تھا۔ میرے افسر نے مجھ پر دو جھوٹے کیسز بنا رکھے تھے جو بڑی سنگین نوعیت کے تھے۔ وہ اس دھوم دھمکے سے بار بار ان کا ذکر کیا کرتا تھا کہ مجھے خود شک پڑنے لگا تھا کہ وہ مجھ پر الزام نہیں دھر رہا تھا بلکہ سچ بول رہا تھا۔ میں خود کو مجرم سمجھنے لگا تھا۔ مجھ پر احساس جرم چھائے جا رہا تھا۔

اس روز شام کا وقت تھا بڑی اداس شام تھی وہ۔ لٹی پٹی۔ اس روز دفتر میں میری بہت تذلیل ہوئی تھی۔ انکوائری کمیشن نے میرے بیان کا مضحکہ اڑایا تھا۔ وہ لوگ جو جانتے تھے کہ مجھ پر بہتان لگایا گیا ہے۔ انہوں نے بھی میرے حق میں گواہی نہ دی تھی۔ دکھ فکر اور اندیشوں کی بوجھل گٹھڑی کندھوں پر اٹھائے میں گھر پہنچا۔ پہنچتے ہی دھڑام سے کھاٹ پر گر پڑا۔ وہاں پڑا رہا پڑا رہا۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک پڑا رہا۔ پھر دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے سر پر کوئی بوجھ نہ ہو۔ ارے وہ گٹھڑی کیا ہوئی، میں اٹھ بیٹھا۔ میرے گرد ایک عجیب سی فضا معلق تھی۔ جیسے جیسے ایک لوری ہوا میں تیر رہی تھی۔ جیسے کمرے میں ایک کھٹکتی کنڈیشنر لگا ہوا۔ جیسے کمرے میں کوئی ہو۔ لگن اور لگاؤ سے بھیگی ہوئی موجودگی۔ یہ کون ہے۔ میرے گھر میں کون گھس آیا ہے۔ میں نے سارے گھر کا چکر لگایا کہ شاید کوئی ہو۔ کوئی بھی نہ تھا۔ پھر بھی کوئی ضرور تھا۔ اس بے نام موجودگی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔

باورچی خانے میں میری بیوی گھٹنوں میں سر دیئے پیاز چیر رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا دیکھتا رہا وہ اکیلی بیٹھی تھی۔ اکیلی 'لقادق' تنہا اسے دیکھ کر مجھے پتہ چل گیا کہ کوئی نہیں ہے، کوئی بھی نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ گھر کی موجودگی ایک کو متاثر کرے دوسرے کو خبر ہی نہ ہو۔

سونے سے پہلے میں پڑھنے کا عادی ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے پڑھنے سے دلچسپی ہے۔ ایک تو اس لیے کہ کتاب سامنے ہو تو نیند آنے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اس لیے کہ تلخ حقائق سے بچنے کے لیے مطالعہ ایک نعمت ہے۔ ان دنوں تو مطالعہ میرے لیے از بس ضروری تھا دفتر حقائق سے فرار کا ایک نعمت ہے۔

ان دنوں تو مطالعہ میرے لیے از بس ضروری تھا دفتری حقائق سے فرار کا ایک ہی راستہ تھا۔ پھر بھی میں زبردستی کتاب پڑھتا تھا۔

بار بار دفتری حالات سامنے آکھڑے ہوتے۔ مطالعے کا عمل رک جاتا دل پر ایک ٹھیس سی لگتی پھر اندیشوں کی لہریں ریگنے لگتیں۔ سرخ چیونٹے میری طرف یورش کرتے پھر سارے جسم میں خوف کی دھنکی بجتی۔

اس روز پتہ نہیں کیا ہوا۔ کتاب ہاتھ میں اٹھائے میں بیٹھا رہا۔ سوچتا رہا۔ حالانکہ عام طور پر میں سوچنے سے گریز کرتا ہوں۔ کیونکہ سوچ مجھے دل خراش و سوسوں کی طرف بہا کے لے جاتی ہے۔ پھر وہی ٹھیس وہی چیونٹے وہی دھنکی۔ اس روز میں سوچ رہا تھا لیکن ذہن میں کوئی بات نہ تھی جیسے ذہن کلفتوں رنجشوں اور خوشیوں سے بے نیاز ہو چکا۔ ماؤف ہو چکا ہے۔

ذہن خیالات سے خالی تھا۔ کوئی تپنی نہ تھی، ٹھیس نہ تھی، چیونٹے نہ تھے، دھنکی نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں خلا میں ڈنگا ہوا ہوں اور یہ خلا بے نام سکون سے بھرا ہوا ہے۔ مطالعہ کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جب کوئی خوف ہی نہ ہو تو فرار کیسا نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ ایسی خوشگوار فضا کو چھوڑ کر کون سوئے۔

اگلے روز جب نیند سے بیدار ہوا تو۔ ارے میں چوٹکا۔ عام طور سے جب میں جاگا کرتا ہوں تو یوں تھکا کٹوٹا ہوا ہوا اٹھتا ہوں جیسے کوئی مار کھا کر اٹھا ہو۔ اس روز میری کیفیت کچھ ایسی تھی جیسے گیس بھرا غبارہ ہو۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے پھول کمرے میں آگھے ہوں۔ چڑیاں چہک رہی تھیں اور سورج کھڑکی میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ارے یہ کیا میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا یہ کیسی صبح ہے۔ کیا میں ہی ہوں یا کوئی اور ہے۔ ساتھ ہی مجھے غصہ آنے لگا۔ یہ کون ہے جو میری شخصیت کو بدل رہا ہے۔ کیوں۔

پھر کوئی ان جانا ہاتھ بڑھا اور اس نے مجھے تھپکنا شروع کر دیا۔ جیسے تھپک تھپک کر مجھے دوسوں سے دور لے جا رہا ہو۔ سارا کمرہ اس تھپک سے بھر گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ ہاتھ ماں کا ہاتھ ہو۔ وہ مجھے تھپک رہی ہے۔ سو جانے کے لیے نہیں بلکہ جینے کے لیے۔ سارا کمرہ جینے کی لذت سے بھرا ہوا تھا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔

پھر دفتر گیا وہاں بھی سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ تذلیل و تضحیک کی باتیں یوں سنائی دے رہی تھیں جیسے دور سے آ رہی ہوں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ باتیں میرے متعلق نہیں بلکہ کسی اور کے بارے میں تھیں۔ ذہن میں ایک اطمینان سا تھا۔ میری میز کے گرد ایک تبسم گھیرا ڈالے کھڑا تھا۔

آج بھی میرا سارا گھر اسی تبسم سے بھرا ہوا ہے۔ رات کو سوتا ہوں تو وہ میری چار پائی پر بیٹھا مجھے تھپک رہا ہوتا ہے۔ جاگتا ہوں تو وہ میرے سر ہانے کھڑا مسکرا رہا ہوتا ہے، کام کرتا ہوں تو وہ میرے پاس بیٹھا اپنی گڈول کی شعاعیں بکھیر رہا ہوتا ہے۔ باہر جاتا ہوں تو وہ مجھے دروازے پر چھوڑنے آتا ہے۔ واپس آتا ہوں تو دہلیز پر بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ اس نے

میری ذاتی زندگی کو کیوں تھس نہس کر رکھا ہے۔ غصے میں میری کنپٹیاں بجتے لگتی ہیں۔ یہ سب کیا ہے تم کون ہو۔ کیوں ہو۔ بولو جواب دو۔

اس نے زبان سے مجھے کبھی جواب نہیں دیا۔ وہ گونگا ہے۔ اس کے وجود سے شعاعیں سی نکلتی ہیں۔ ایک لطیف سی لرزش میرے بند بند سے لگراتی ہے۔ جسم میں ایک ٹک ٹک بجتے لگتی ہے۔ پھر احساسات کا ایک دھواں سا اڑتا ہے میرے سوال کی ساری تلخی نچر جاتی ہے۔ مٹھاس کی اک پھوار پڑتی ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے میرے سوال کا جواب مل گیا ہو۔

اس نے کبھی میری میں میں رد و بدل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میری غلاطت پر کبھی ناک نہیں چڑھائی۔ میری کج فہمیوں گوشوں پر جب اس کی رو پہلی روشنی پڑتی ہے میں ان گوشوں کو دیکھتا ہوں تو میرا دل کراہت سے بھر جاتا ہے۔ سراسر احساس ندامت سے جھک جاتا ہے۔

پھر میری انا کا ترخا ہوا بت سرائٹھاتا ہے نہیں نہیں میں ان گوشوں کو صاف نہیں کروں گا نہیں کروں گا۔ میں جیسا بھی ہوں ہوں۔ مجھے خود پر کوئی ندامت نہیں ہے۔ میں ایسے ہی جینا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنی ”میں“ سے پیار ہے میں اپنی ”میں“ کو نہیں بدلوں گا۔ کسی کو مجھے بدلنے کا حق نہیں۔

ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ فضا سے ایک سرگوشی ابھرتی ہے۔ کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔ ارد گرد کی فضا مجھے تھکتی ہے۔ تو کیوں میری ہر بات مانے جا رہا ہے۔ کیوں۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ ضرور اس میں کوئی چالاکی ہے۔ جواب میں سارا کمرہ ایک بے نام لطیف تبسم سے بھر جاتا ہے۔ بے شک اس نے مجھے اپنا رکھا ہے لیکن میں۔ میں اسے کبھی نہیں اپناؤں گا۔ کیوں اپناؤں۔ کیوں کہ مجھے پتہ ہے وہ اپنی روداری سے۔ ہمدردی سے، محبت سے، میری ”میں“ کو توڑ دے گا۔ پھر میرے پلے کیا رہ جائے گا۔ آج تک اس نے مجھ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ صرف ایک مطالبہ۔ وہ بھی مطالبہ نہیں چونکہ اس میں طلب نہیں منت ہی منت ہے۔

اس کا کہنا ہے اپنے دکھوں و سوسوں پریشانیوں، غموں اور تکلیفوں کی گٹھڑی خود نہ اٹھا۔ مجھے سوئپ دے۔ مجھ پر بھروسہ کر۔ خود کو میرے بھروسے پر چھوڑ دے۔

جب میں اپنے فکروں کی گٹھڑی سر پر اٹھائے گھر پہنچتا ہوں تو گھر کی فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا ہے۔ میرے گرد چاروں طرف سے منت بھرے ہاتھ لپکتے ہیں۔ یہ گٹھڑی مجھ پر لا دے مجھے دے دے۔ خود نہ اٹھا فضا سرگوشیوں سے بھر جاتی ہے

منتوں کا ایک طوفان اٹھاتا ہے۔ مجھ پر بھروسہ کر۔

نہیں نہیں۔ گٹھڑی میں اس کے حوالے کیوں کروں۔ یہ میری گٹھڑی ہے۔ میری ساری زندگی کی کمائی ہے۔ مجھے اپنی مشکلات سے عشق ہے اپنی فکر مند یوں سے محبت ہے۔ میں بڑی محنت سے اپنے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہوں۔ بڑے شوق سے اپنے راستوں پر خاردار پودے اگاتا ہوں تاکہ اپنی آبلہ پائی پر بیٹھ کر روسکوں یہی میری سب سے بڑی عشرت ہے۔ یہی میری سب سے بڑی لذت ہے۔ میں اپنے دکھوں کی گٹھڑی کیسے اسے تھما دوں۔

میں تو شک کا دیوانہ ہوں۔

میں کس طرح اس پر بھروسہ کر لوں۔

چاروں طرف سے میری جانب ہاتھ لپکتے ہیں۔

منتوں سے سارا کرہ بھر جاتا ہے۔

کب سے یہی ہوتا آ رہا ہے۔

وہ منتیں کر کر نہیں ہارا۔

میں دھمکیاں دے دے کر ہارتا جا رہا ہوں۔

مجھے ڈر ہے کہ میں اپنے دکھوں کی گٹھڑی اس کے حوالے نہ کر دوں۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اس پر بھروسہ کر کے بیٹھ نہ جاؤں۔

صاحبو کیا وہ کبھی مجھ سے مایوس نہ ہوگا۔



ان پورنی

پتہ نہیں

یہ کیا پلٹ کیسے ہوئی۔ لیکن کیا پلٹ جب بھی ہوتی ہے ایسے ہی ہوتی ہے کچھ پتہ نہیں دیتی کہ کیوں ہوئی کب ہوئی۔ اس گوری کی طرح دبے پاؤں آتی ہے جو پائل کی جھنکار کو بیرن سمجھتی ہو۔

اس کا پلٹ کے تحت آنند کمار کمار رہا نہ آنند رہا۔ پہلے وہ کمار بھی تھا آنند بھی۔ اس لیے کہ ریاست انگاہ کے مہاراج کا پتر تھا۔ آنند اس لیے کہ کوئی چاہ نہ تھی جو پوری نہ ہوئی ہو۔ ادھر چاہ کی ادھر پوری ہوئی۔ یہی آنند ہے نا کہ ہر آرزو پوری ہو جائے۔ نہ انتظار نہ محرومی نہ بے چینی۔ آنند کو پتہ ہی نہ تھا کہ ایسی آرزو بھی ہو سکتی ہے جو پوری نہ ہو۔

زندگی میں پہلی بار اس کے دل میں ایسی آرزو پیدا ہوئی تھی جسکے پورے ہونے کی کوئی صورت نہ تھی یہ آرزو کوئی ایسی مشکل بھی نہ تھی پتلی، دہلی، سوئی سوئی، کھوئی کھوئی، ڈوبتی چھوئی موتی خود سے دور لے جانے والی ایک گائیک تھی۔ ان پورنی۔

ان پورنی جب سے راجدھانی میں آئی تھی اک دھوم مچی ہوئی تھی اس کا چرچا نہ تو رنگ روپ کی وجہ سے تھا نہ گائیکی کی وجہ سے۔ رنگ روپ میں کئی گانے والیاں اس سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ گائیکی میں بھی وہ ایسی جاذب نہ تھی کہ سننے والے تڑپ کر رہ جائیں۔ الٹا تو سنانے کیلئے گاتی ہی نہ تھی۔ نرت لبھانے کیلئے نہ کرتی۔ اپنے قریب لانے کیلئے نہیں۔ الٹا دور لے جاتی۔ گائیکی میں تیرتی نہ تھی ڈوب جاتی تھی۔ جسے خود کی سدھ بدھ نہ رہے وہ دوجے کی سدھ بدھ کیا مارے گی۔ ان سب باتوں کے باوجود ان پورنی کی دھوم مچی تھی۔

شاید بھید یہ تھا کہ ان پورنی میں لو بھ نہ تھا۔ نہ کمانے کا نہ خود کو اچھالنے کا۔ نہ آپ جھلکتی تھی نہ دوجوں پر چھینٹے اڑاتی۔ جلتی ضرور تھی پر مدھم مدھم۔ نما نما گاتی۔ نما نما جیتی۔ جیون میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نمی نمایاں بھڑک کر جلنے والوں کو ماند کر دیتی ہیں۔ تشنگی کا ایسا دریا بہا دیتی ہیں کہ بڑے بڑے تیراک ڈوب جاتے ہیں۔ آنند بہت بڑا تیراک تھا۔ ڈوبنا نہیں جانتا تھا۔ جسے دھن دولت اور مرتبہ مان کے مشکیزے حاصل ہوں وہ بھلا کیوں ڈوبے۔

آنند نے ان پورنی کی دھوم سنی تو شوق چرایا کہ چلو چل کر دیکھیں جسکی اتنی دھوم ہے وہ ہے کیسی۔ یار دوستوں کی سنگت میں وہ

چو بارے میں پہنچا تو اسے دیکھ کر ان پورنی کی نائیکہ کنول منی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ کبکی کبکی رہ گئی ہوش آیا تو سواگت میں بچہ بچہ گئی۔ اتنی آؤ بھگت کی کہ وہ امیدیں رچا کے بیٹھ گئی۔ پھر ان پورنی آئی۔ ہاتھ جوڑنمسا کر کیا۔ مسکائی لبجائی اور بیٹھ گئی۔ پھر وہ سازوں کی دھن میں کھو گئی۔ بے بے وقتی کی دھن تھی۔ پیاس پڑوں گی پلنگا نہ چڑھوں گی۔

ایک وہ جسم کی ادھ کلی تھی دو بے آنکھ ادھ کلی تھی۔ دیکھنے والی نہیں دکنے والی۔ وہ بھی آدھی اوٹ میں۔ یوں جان لو کہ سامنے ایک ٹٹمانے والا دیا جل رہا تھا۔

ان پورنی اس کے پاس بیٹھی تھی۔ پر پاس نہ تھی آدھی نہ جانے کہاں۔ گانے میں اتنا گداز جیسے واقعی پیاس پٹی ہو۔ قربت میں اتنی دوری جیسے پلنگا چڑھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ہو۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ پر ایسا ہوتا ہے جو ساری کی ساری آ بیٹھتی ہیں۔ وہ صرف جسم کا جھنجھنا بجا دیتی ہیں جو پاس ہو کر بھی آدھی نہ جانے کہاں ہوتی ہیں۔ وہ وجود کی سریتیاں چھیڑ دیتی ہیں۔ ان پورنی نے آنند کے وجود کی سریتیاں چھیڑ دیں۔ ایک انجانا نغمہ ابھرا جس سے وہ واقف نہ تھا۔ کیسے واقف ہوتا۔ وہ تو ایسیوں کا شیدا تھا جو ساری کی ساری پاس آ بیٹھتی ہیں وہ سمجھتا تھا پالینا ہی دولت ہے۔ نہ پانے کی عظمت سے واقف نہ تھا۔

اس رات آنند راج بھون واپس پہنچا تو وہ اکیلا نہ تھا۔ ان جانے میں ان پورنی کو ساتھ لے آیا۔ خود پر برہم تھا۔ یہ مجھے کیا ہوا بکھرا بکھرا کیوں ہوا۔ اس نے وہ رات ٹہل ٹہل کر کاٹی۔

پھر کئی ایک راتیں ٹہل ٹہل کر کٹیں۔ پہلے خود سے لڑتا جھگڑتا رہا۔ نہیں نہیں کوئی بات ہے کہ چو بارے بیٹھی دو نکلے کی چھو کری راج کمار کو اتھ پلٹھ کر رکھ دے۔ لیکن خود سے کوئی کب تک لڑے گا۔ آخر ایک رات اپنے خاص نوکر سیوک ناتھ کو بلا یا۔ سیوک ناتھ جا۔ ابھی جا گاڑی جوت کر ساتھ لے جا۔ موتی بازار سے ورے ورے گاڑی کھڑی کر دیجیو۔ پیدل ان پورنی کے چو بارے میں جانیو۔ نائیکہ کنول منی سے کہو راج کمار ان پورنی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔۔۔ اور دیکھو گاڑی محل کے صدر دروازے پر نہ آئے۔ بات نہ نکلے کنول منی کو پتہ چلا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بھاگی بھاگی ان پورنی کے پاس گئی۔ دھن بھاگ پتری جوتو آج کی رات جاگی جاگی کالے سوئی سوئی نہ رہے تو کیا پتہ کل رانی بن جائے بیچاری کنول منی کو کیا پتہ تھا کہ جاگی نے نہیں ادھ سوئی نے جوت جگائی ہے جوانی میں کنول منی خود کٹورہ سی کھلی آنکھ والی تھی۔ مدھ بھری ادھ کلی کے چٹکارے واقف نہ تھی۔

ان پورنی راج بھون میں داخل ہوئی جیسے سپنا دیکھ رہی ہو سہمی ہوئی گھبرائی ہوئی۔ ہوائیاں اڑی ہوئیں۔ اس نے ارد گرد کی

جانب نہ دیکھا۔ محل کی سچ دھج پر دھیان نہ دیا۔ کمار کی آنکھوں میں کھینے کے بجائے اپنی آنکھیں چرائے رکھیں۔ ہاتھ جوڑے کھڑی رہی۔ کمار بولا آؤ ان پورنی بیٹھو۔ یہ سن کر وہیں فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ کمار بھی اسکے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔

کمار بولا ان پورنی تو نیچے کیوں بیٹھ گئی۔

بولی مہاراج جہاں میری جگہ ہے وہیں بیٹھتی نا۔ آپ کے چرنوں میں۔

ہم نے تجھے پلنگہ پر بیٹھنے کو بلایا ہے۔

بڑی کرپا ہے مہاراج پر میں اس جوگی نہیں۔

جوگی نہیں کہ پلنگہ چڑھنے کو ایمان جانتی ہے۔ کمار نے طعنہ دیا۔

نہ مہاراج وہ بولی جدمان ہی نہیں تو ایمان کیسے ہوگا۔ پلنگہ چڑھنا تو ویشیا کا دھندہ ہے مہاراج۔

دھندہ ہے تو گھبراہٹ کیوں۔

اس دھندے جوگی نہیں مہاراج۔

کچھ کمی ہے کیا۔

پتہ نہیں مہاراج بت چڑھتا ہے۔ چت نہیں چڑھتا۔

کمار یہ سن کر ٹھٹھکا پھر بولا چت کہیں لگا ہے کیا۔

نہ مہاراج

یہ کیسے ہو سکتا ہے ان پورنی

پتہ نہیں مہاراج کہ ایسے کیوں ہے۔ پر ایسے ہی ہے۔ میں نام کی ان پورنی نہیں جیو کی بھی ان پورنی ہوں اپنے آپ میں پورن

نہیں ہوں۔

کیا مطلب آنند نے پوچھا۔

ادھوری ہوں مہاراج آدھی ہوں آدھی نہیں ہوں۔

میں نہیں سمجھا وہ گنگنایا۔

میں آپ نہیں سمجھی مہاراج آپ کو کیسے سمجھا دوں۔

وہ چپ ہو گیا۔

یوں سمجھ لیجئے مہاراج وہ گنگنائی کہ چھٹی کے چاند آسمان ہوں آدھی ادھر ہوں آدھی پتہ نہیں کدھر ہوں۔ پلنگہ پروہ براجمان ہوتی ہیں مہاراج جو پورن ماشی کے چندا کی طرح پورن ہوتی ہیں۔ ان پورنی بیچاری پلنگہ پر کیا چڑھے گی۔ چڑھی نہ چڑھی برابر۔ وہ چپ ہو گئی۔ سیس نوائے نین جھکائے بیٹھ رہی۔

اس کی باتیں کمار کے ہر دے پر چیونٹیوں کی طرح چڑھ گئیں۔ دل میں دھنس گئیں۔ اتنا پیچا کہ جواب دینا بھول گیا۔ پتہ نہیں کس بات پر۔ لاج پر جوان پورنی کے کھ پر گٹھابن کر چھائی تھی بھولپن پر یاسج کی باس پر جو اس کے منہ سے نکلی ہوئی باتوں میں یوں رچی مچی تھی جیسے پیاز میں آنسو رچے ہوتے ہیں۔

آنند کو چپ لگ جائے تو اتنی دور لے جاتی ہے کہ واپس آنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر پورن بندہ بھی ان پورن ہو جاتا ہے۔ کمار اور ان پورنی دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ بیٹھے رہے۔ سیوک ناتھ نے کئی بار باہر جھانکا۔ بیچارہ حیران۔ اندر دوبت بیٹھے تھے۔ ایک دو بجے کے پاس۔ ایک دو بجے سے دور۔ بہت دور جیسے ایک دو بجے کی خبر نہ ہو۔ سیوک ناتھ سمجھتا تھا کہ راج کمار جو کئی دنوں سے کھویا کھویا نظر آ رہا تھا۔ ان پورنی کے آنے پر پورا ہو جائے گا اسے اپنا کھویا آدھا پھر سے مل جائے گا۔

پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا تھا۔ راج کمار پر بے چینی کے بادل چھائے تھے۔ پھر کوئی چتر نینی آئی پلنگہ چڑھی۔ پھلجھڑیاں چلیں ہوائیاں چھوٹیں رنگ دار چکر گھومے جھولے پھر سارا کمرہ جگ جگ مگ ہو گیا تھا۔ پر آج یہ کیا ہو رہا ہے۔ دونوں ہی بت بیٹھے ہیں ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ جد توڑی بیچاری نہ ہو بت بت کیسے بنے۔ پھر یہ دوبت کیسے بن گئے۔ بھگوان تیری لیلیا تو ہی جانے۔

جب آنند کمار واپس اپنے آپ میں آیا تو وہ نہ رہا تھا جو چپ سا گر میں ڈوبنے سے پہلے تھا اور اس کی نظر میں ان پورنی وہ ان پورنی نہ رہی تھی جو پلنگہ چڑھانے کو بلائی گئی تھی۔ ان پورنی آنند بولا۔ سہی سہی کیوں بیٹھی ہے۔ چنانہ کر جو تو چاہے گی وہی ہوگا۔ ان پورنی چاہے ادھوری تھی پر استری تھی۔ اس نے دیکھا کہ مائع اتر گئی ہے نظر دھل گئی ہے۔ آواز نچلے سروں پر گر گئی ہے۔ لے لمپٹ ہو گئی ہے۔ سر میں کامنا کی جگہ براہ کی مینڈھ لگ گئی ہے۔

ان پورنی وہ بولا جو میں تجھے اپنا بنانا چاہوں تو۔۔۔

نہ مہاراج کا ننا بولی۔ شہر میں نہیں۔ شہر تو مہاراج تن کا پن گھٹ ہے۔ جہاں ہر دے کی جھجھریا بھری جاتی ہیں۔ شہر تو تن کا بیو پاری ہے۔ تن کا پجاری ہے اور سر مہاراج وہ تو جگھٹ کی چیز نہیں۔ اکیلے کی چیز ہے۔ بن کا کوئی جھنڈ ہو۔ پہاڑ کی کوئی کھوہ ہو۔ ویرانے میں کوئی مندر ہو وہاں کوئی سر کا پجاری مل جائے تو دھن بھاگ۔

کانتا سے ملنے کے بعد آنند کی سر کی لگن اور بڑھ گئی۔

اتفاق سے سوامی ہمیش چندر شہر آ گئے۔ ان سے جاملا۔ سوامی بولے پتر یہ تو کس جھنجھٹ میں پڑ گیا۔ سر کا تو کوئی انت نہیں یہ ساری رام لیلہ جو ہے یہ سر کا ہی تو چیتکار ہے۔ کرشن مہاراج بانسری بجا رہے ہیں اور ہمارے سامنے یہ تماشا ہو رہا ہے۔ سر کی رچنا جانا چاہتے ہو پتر تو گوالکا پر بت پر تلسی مہاراج کے مندر روا جاؤ اگر تمہارے من کا کان بند نہیں تو سارا بھید کھل جائے گا۔

آنند کمار سوچتا رہا پھر اس نے فیصلہ کر لیا۔ پھر وہ مہاراج سے جاملا۔ بولا پتا جی مہاراج میں یا ترا جانا چاہتا ہوں آ گیا دیجئے۔

یا ترا۔ کیسا یا ترا مہاراج نے پوچھا۔

مہاراج میں گوالکا پر بت پر تلسی مہاراج کے مندر روا کے درشن کرنا چاہتا ہوں۔

مہاراج کے ماتھے پر تیوڑی پڑ گئی۔ انگاہ کے راج کمار کو تلسی مہاراج کی لگن کیسے لگ گئی۔ اچھا وہ بولے۔ ہم وچار کر کے بتائیں گے۔

راج کمار کے یا ترا جانے کی بات سارے محل میں گونجی۔ باتیں ہوئیں۔ ہاتھ چلے سینے تھام لیے گئے۔ انگلیاں ہونٹوں پر رکھی گئیں۔ راج رانی نے کہا۔ مہاراج ضرور اس میں کوئی بھید ہے۔ کمار کے بھیدی نوکر کو بلا یا گیا۔ بھید کھلنے کے بجائے اور الجھ گیا۔ سیوک ناتھ بولا مہاراج ساری شرارت ان پورنی کی ہے اس نے راج کمار کو بت بنا دیا ہے۔ ان پورنی کو حاضر کیا گیا۔ وہ بولی مہاراج میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ مہارانی بولی۔ بس تو نے تو غضب کیا کہ کچھ نہ کیا۔ کچھ نہ کر کے تو نے کمار کا دل اچاٹ کر دیا۔ اب جا کچھ کر کوئی جتن کہ ویرانے سے ہٹ کر آبادی کی طرف دھیان لگے۔ یا ترا کی لگن ٹوٹ جائے۔

اسی رات ان پورنی راج کمار کے چرنوں میں جا بیٹھی۔ آپ میرے کارن جا رہے ہیں ناراج کمار اس نے پوچھا۔

ہاں تیرے کارن۔

تو نہ جائیے۔ میں داسی بن کر آپ کے ساتھ رہوں گی۔

مجھے داسی نہیں چاہیے۔

ان پورنی آپ کی سنگ ساتھ بن کر رہے گی۔

جاؤ لڑکی مجھے ان پورنی چاہیے وہ پورنی جسے میں خود سر سے پورن کروں۔ ان پورنی نے بڑے جتن کئے پر آخر جان لیا کہ بات اس کے بس سے باہر نکل چکی ہے۔

مہاراج کو پتہ چل گیا کہ راج کمار نہیں رکے گا۔ روکا گیا تو ٹوٹ جائے گا۔ پھر لوٹ آنے کی صورت بھی نہ رہے گی۔ اس لیے انہوں نے آگیا دے دی۔ ساتھ چھ ایک نوکر کر دیئے انہیں تاکید کر دی کہ ساتھ ساتھ رہیں نظر سے اوجھل نہ ہونے دیں۔

ان پورنی راج کمار کو جاتے دیکھتی رہی۔ جب وہ نظر سے اوجھل ہوا تو دفعتاً اس نے جانا کہ وہ تو پورن ہو گئی ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ کمار راج پاٹھ چھوڑ کر سر کی نہیں بلکہ اس کی ڈھونڈ پر نکلا ہو۔ اس خیال پر وہ اتنا خوش ہوئی کہ پورن ہو گئی۔ پر یہ خوشی شانت کرنے والی نہ تھی بلکہ بے کل کرنے والی تھی۔ سو وہ بے کل ہو گئی۔

ایک سال بیت گیا اس کی بے کلی بڑھتی گئی۔

پھر ایک دن راج کمار کے ساتھ گئے ہوئے پانچ نوکر واپس آ گئے۔ بولے مہاراج ہم نے تو کمار کا بڑا ادھیان رکھا پر ایک رات راج کمار سیوک ناتھ کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ ہم سوتے ہی رہ گئے پھر ہم نے ڈھونڈ کی۔ آس پاس کو چھان مارا پر کوئی بھولا ہوتا تو گھر آتا۔ ان پورنی نے سنا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ چار ایک دن ٹھنڈی برف پڑی رہی پھر اٹھی۔ اب میں یہاں کس لیے بیٹھی ہوں۔ اب یہاں کون آئے گا۔ جس ڈھونڈ پر میں کو دنہ نکلی تھی دو بجے کو اس ڈھونڈ پر لگانے کا مجھے کیا ادھیہ کا تھا۔ سارا دوش میرا ہی ہے اس نے دھندلے کو سمیٹا اور چل نکلی۔ جگہ جگہ گھومی مندر مندر ٹھکانا کیا۔

میگھ مندر شری ہمیش چندر مل گئے۔

بولے پتری تو یہاں میگھ مندر کے ویرانے میں کیا کر رہی ہے۔

ان پورنی بولی۔ مہاراج سر کی ڈھونڈ میں نکلی ہوں۔

نہ پتری وہ بولے۔ تو سر کی ڈھونڈ کیسے کرے گی تو تو صرف دکھ سے واقف ہے۔ سر کی ڈھونڈ تو وہ کر سکے ہے جو دکھ کے ساتھ کھ سے بھی واقف ہو۔ جو لو بھ لگن بیت چکا ہو۔ رنگ رلیاں منا چکا ہو۔ جیون کی موم بتی دونوں سروں پر جلا کر دیکھ چکا ہو۔

مہاراج۔ وہ بولی میں نے بھی تو رنگ رلیاں منائی تھیں۔ میں تو ویشیا تھی۔ پلنگاہ چڑھتی رہی۔

اونہوں وہ مسکائے ویشیا خالی تن کے نہیں ہوتی۔ تن من دونوں کی ہوتی ہے۔ تیرا چت تو بت میں نہیں ہے۔ تو کیسے ویشیا بنتی۔ نہ

نہ پتری پہلے اپنے آپ کو جانو پھر ڈھونڈ پر نکلو اور پھر اپنا آپ تیاگ کر سب کچھ پالو۔ یہی ڈھونڈ کا بھید ہے اور پتری تو استری ہے۔ استری سرکی ڈھونڈ پر نہیں نکلتی۔ سروالے کی ڈھونڈ پر نکلتی ہے۔ ان پورنی کی آنکھوں میں آنسو آگئے گردن اٹک گئی۔ یہ دیکھ کر سوامی بولے تو ریاست انگاہ کی ہے کیا۔ ہاں مہاراج پورنی گنگنائی۔ وہ بولے تو نے ہی راج کمار کو سرکی ڈھونڈ پر لگایا تھا۔ وہ چپ ہو گئی۔ وہ مسکائے بولے جا پتری اس کی ڈھونڈ کر جس کی ڈھونڈ پر نکلے ہے۔ خود کو دھوکا نہ دے۔ خود ساتھ نہ دے تو ڈھونڈ کبھی پورن نہیں ہوتی۔ اس رات پورنی سوچوں میں پڑی رہی۔ رورو کر بے حال ہو گئی۔ ہے بھگوان میں کیا کروں۔ کس کی ڈھونڈ کروں۔

پھر وہ مندر مندر پھری۔ دیوی دیوتا کے چرنوں میں بیٹھ کر روئی۔ بابا کارکی ہے دیوتا مجھے بھگوان کی ڈھونڈ دے دو۔ نہ سر رہے نہ سروالا رہے۔ نہ بانس رہے نہ بانسری۔ لیکن سیس نوا کر جب وہ سراٹھاتی تو دیوتا کے جسم پر آنند کمار کا مکھ سجا ہوتا۔ وہ جگہ جگہ پھری۔ استھان استھان گھومی۔

بھگوان کی لگن کے لیے بھجوں کے بہانے روئی پٹنی لیکن ہر دیوی دیوتا کے بت پر آنند کمار کا مکھ لگا رہا۔ آخر وہ ہار گئی۔ ڈھونڈ چھوڑا دھوری کے مندر میں اک کوٹھڑی میں پڑ رہی۔

ہے بھگوان جو تو چاہے دے نہ چاہے نہ دے پر میرے راستے کا پتھر تو ہٹا دے پاؤں کے بیڑی تو کاٹ دے۔ ایک روز مادھوری مندر کی بوڑھی پجاریں دوڑی دوڑی آئی۔ بولی پتری دو سوامی آ رہے ہیں۔ تو دو بڑی کوٹھڑیاں صاف کر دے وہ کچھ دناں یہاں نکلیں گے۔

کون آ رہے ہیں پجاریں۔ ان پورنی نے پوچھا۔

ایک تو سوامی آنند کمار ہیں جو اوپر تلسی مہاراج سے آئے ہیں۔ یہ سن کر ان پورنی کا دل دھک سے رہ گیا باجو کا نپا جھاڑو گر گیا۔ پجاریں نے دیکھا۔ ہے بھگوان۔ ہر دے میں اتنی بھیڑ۔ وہ دیکھ نہ سکی۔ منہ پھیر لیا۔ ان دیکھا کر دیا۔ بات جاری رکھی تاکہ دیکھن کا بھید نہ کھلے۔ بولی دو بے سوامی ہمیش چندر ہیں نیچے نارائین نگر سے پدھاریں گے۔ جب سوامی آنند کمار پہنچے تو مندر کی ساری پجاریوں نے باہر نکل کر ان کا سواگت کیا۔ لیکن ان پورنی کوٹھڑی سے نہ نکلی۔ وہ کواڑ کی درز سے دیکھتی رہی۔۔۔ ہاں وہی ناک نقشہ وہی روپ سروپ لیکن جیسے ہوا بدلی بدلی ہو۔۔۔ ان کے پیچھے پیچھے وہی ان کا نوکر سیوک ناتھ تھا۔

جب شام پڑی تو وہ سیوک ناتھ کے پاس گئی ہاتھ جوڑنمسا کر کیا۔ سیوک ناتھ نے پرنام کا جواب دیا۔ بولی تو نے مجھے پہچانا۔۔۔ میں ان پورنی ہوں۔ مجھے سوامی سے ملا دے۔

سیوک ناتھ بولا۔ ان پورنی کوئی اور مانگ مانگ یہ مانگ میرے بس کی نہیں۔ سوامی راہ چلتے مل لیں ویسے کسی سے نہیں ملتے۔

تو اک بار کہہ کر تو دیکھ کہ ان پورنی آئی ہے۔

جرور کہوں گا۔ وہ بولا۔

سیوک ناتھ نے ایک بار کہا دو بار کہا تین بار کہا پر کچھ نہ ہوا۔

کچھ نہیں ہوا۔ ان پورنی نے پوچھا۔

اوںہوں سیوک ناتھ نے سر ہلا دیا۔

سوامی جی نے سنا نہیں وہ بولی۔ ٹھہر میں اپنا نام پتر پامونا مونالکھ کر لاتی ہوں۔ تو سوامی جی کے ہاتھ میں پتر تھما دیجیو۔ سیوک

ناتھ پتر اندر لے گیا۔ باہر نکلا تو ان پورنی نے پوچھا۔ کیوں کچھ ہوا۔

ہاں ہوا۔ وہ بولا۔ ان پورنی کا کھ کھل گیا۔ سیوک بولا۔ سوامی جی نے پتر کو دیکھا۔ بولے کون ان پورنی۔

ان پورنی سن کر وہیں گھاس پر ڈھیر ہو گئی۔

اگلے روز وہ پھر سیوک ناتھ کے پاس آئی۔ بولی بس ایک بار اور سیوک ناتھ ایک بار۔

آخری بار سوامی سے جا کر کہو۔ وہ ان پورنی جسے تم نے چلتے سے کہا تھا۔ ان پورنی میں تجھے آپ سر سے پورن کر دوں گا۔

ان پورنی نے بات پوری کر کے سر اٹھایا تو دیکھا کہ سیوک ناتھ کے پیچھے سوامی ہمیش چندر کھڑے مسکار رہے ہیں۔ سوامی بولے۔

ان پورنی اب بیکار ہے پتری۔ اب تیرے لیے وہاں کچھ نہیں دھرا۔ پہلے وہ پورن تھا۔ پرتو نے اسے سر کی ڈھونڈ دی۔ وہ تیری خاطر سر

ڈھونڈتا رہا۔ جو سر پانے سے پہلے تو اسے اپنا لیتی تو اپنا لیتی۔ پرتو اس نے سر کا بھید پالیا اور سرنے اسے ان پورن کر کے بھگوان کی

ڈھونڈ پر لگا دیا۔ اب وہ تیری خاطر نہیں اپنی خاطر ڈھونڈ میں لگا ہے اب وہ کیا جانے کہ ان پورنی کون ہے۔

ان پورنی کی چیخ نکل گئی۔

مندر کی پجارن باہر نکل آئی۔ کیا ہوا۔ یہ آواج کیسی تھی۔

کچھ نہیں سوامی ہمیش بولے اس پتری کے راستے کا پتھر ہٹ گیا۔ اسے رستہ مل گیا۔ یہ جارہی ہے پجارن اسے وداع کرو۔ لیکن

پجارن نے ان پورنی کی طرف دیکھ کر کہا۔ یہ آنسو۔ سوامی ہمیش مسکرائے۔ یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ جاؤ پتری۔ اب تم آزاد ہو۔ پاؤں

کی بیڑی کٹ گئی۔ دھن بھاگ تمہارے۔



پنک

مائی گاڈ۔ اتنی سجاوٹ۔ اتنی سجاوٹ دیکھ کر دل دق ہو جاتا ہے آئی فیل سک الرجک ہو رہی ہوں۔ سجاوٹ تو ان سپائس اچھی لگتی ہے۔ یہاں ہو۔ وہاں نہ ہو۔ ادھر سادہ سادہ ادھر سجاوٹ۔ یہ نہیں کہ سارا گھر سجاوٹ سے یوں تھوپ دیا جیسے دیہاتی دیوار پر ایلے تھوپ دیتے ہیں۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ گھر افلونس زدہ ہے۔ افلونس تو خیر ٹھیک ہے۔ لیکن اسے خواہ مخواہ اچھا لانا۔ اور پھر اتنی گاڑھی نمائش۔ بھی ہلکی ہلکی رکھو۔ نمی نمی۔ مدھم مدھم۔ سینٹھ گھر نہ لگے۔

پتہ نہیں افلونس کو زندگی سے بیر کیوں ہے۔ ادھر افلونس آئی ادھر زندگی رخصت۔ نہ انفرادیت رہی نہ چمک صرف ٹریڈیشن۔ دیکھ لو یہاں سب مردے ہیں۔ ٹریڈیشن کی چادر میں کفنائے ہوئے مردے بائی گاڈ۔ مشک کا فور کی بو آتی ہے۔ سوچتے یوں ہیں جیسے برسوں سے کیا جا رہا ہے آئسٹ ٹرو تھ یہاں تو کمیونٹی ٹریڈیشن کی ریلز بچھی ہیں۔ سوچ کی گاڑی چلے تو ریلز پر۔ نہیں تو ڈے ریل۔ ختم۔

مانتی ہوں میں کہ پیسہ بڑی چیز ہے۔ چھوٹے چھوٹے آرام آسائشیں خریدو۔ سجاوٹیں کر لو۔ گوٹے کناریاں لگا لو۔ سب ٹھیک لیکن آسائشیں آرام تو دیک کی طرح چاٹ جاتے ہیں۔ نہ زندگی کی چمک رہتی ہے۔ نہ تڑپ نہ جدوجہد۔ بس آرام اور آسائشوں کی لحد میں پڑے رہو۔ پڑے رہو۔ اور یہ سب اسے کہتے ہیں۔ لو ان کفرٹ۔ لیکن آرام جینے بھی دے۔ کہتا ہے جیو مگر جیو نہیں زندگی میں کوئی ہلکی ہلکی بے آرامی ہو۔ بے اطمینانی ہو۔ تھوڑی تھوڑی تکلیف۔ پریشانی۔ کنکشن۔ جدوجہد۔

مائی گاڈ یہ آرام تو مجھے چائے جا رہا ہے۔ جو میں نے ابھی ابھی کچھ نہ کیا تو سمجھو ختم۔ دی اینڈ۔ گھر والے سب مجھ سے ناراض ہیں۔ ڈیڈی می بھائی بھائی سب۔ ڈیڈی کہتے ہیں۔ انجنا تو ورکنگ وومن نہیں بن سکتی۔ کیوں نہیں بن سکتی بھلا۔ کہتے ہیں ورکنگ وومن وہ ہوتی ہے جس کا کام کرنے کے بغیر گزارہ نہ ہو۔ جو کیپ دی پاٹ بائنگ کے لیے کام کرنے پر مجبور ہو۔ تم سیٹھانی ہو کام کرنے پر مجبور نہیں ہو اس لیے ورکنگ وومن نہیں بن سکتی۔ لو یہ کوئی آرگيومنٹ ہے بھلا۔ کیا ضروری ہے کہ نیڈی ہو۔ بھئی ورکنگ وومن تو ایک ایٹی ٹیوڈ ہے۔ زندگی کا ایٹی ٹیوڈ۔ چاہے امیر ہو غریب ہو۔ سلف سفیشٹ ہو۔ محتاج ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

مئی کہتی ہیں ورکنگ وومن بننا تو آج کل کا فیشن ہے۔ لڑکیاں کام نہیں اپنا رہیں فیشن اپنا رہی ہیں۔ اک چاؤ ہے۔ مردوں کے

نام چیلنج ہے کہ لو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گی۔ کندھے سے کندھا جوڑ کر قدم سے قدم ملا کر۔ چار چھ سال یہ چاؤ چلتا ہے۔ پھر شادی ہو جاتی ہے۔ بچے ہو جاتے ہیں۔ بس ورکنگ وومن سوکھ کر جھڑ جاتی ہے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

بھائی کہتے ہیں انجنا یہ تو ایک لائف پیٹرن ہے ٹپ ٹپ چلنا۔ پھنسنے ہوئے لباس پہننا۔ آدھے زمانہ آدھے مردانہ۔ کندھے پر تھیلہ لٹکانا۔ پٹاخ پٹاخ باتیں کرنا فرانگریزی بولنا۔ بٹر بٹر دھوئی دھائی آنکھوں سے دیکھنا۔ اسے کام سے کوئی تعلق نہیں ورکنگ ہو یا نہ ہو۔ پیٹرن ایسا ہو۔ گھڑی چلے نہ چلے پر رسٹ پر بندھی ہو۔

بھابھی کچھ نہیں کہتی صرف مسکرا دیتی ہے وہ تو پیدائشی سیٹھانی ہے لڑکی پن کبھی آیا ہی نہیں۔ ہماری کیونٹی کی ٹریڈیشن میں پلی ہے نا۔ ہٹاؤ۔ اس کا کیا ذکر۔ بے چاری بھی ڈال ہے۔

ممی کہتی ہے انجنا یہ تو کیسا لباس پہنتی ہے۔ ذرا بھی ڈگنٹی نہیں ہوتی۔ بیٹھتی مرسیڈیز میں ہے اور کندھے پر تھیلہ لٹکاتی ہے۔ کوئی بات ہے بھلا۔ پیٹ نہیں ممی ڈگنٹی کسے سمجھتی ہے۔ بن سنور کر بیٹھ جاؤ یوں کہ زندگی کی ذرا سی رمت باقی نہ رہے۔ بالکل مردہ۔ بنی جی ڈال جیسے بھابھی ہے۔

ممی تو خود ڈیڈ باڈی ہے۔ چلتی پھرتی ڈیڈ باڈی۔ بناؤ سنگھار کر کے بیٹھ رہتی ہے۔ سارا دن حکم چلاتی ہے یہ کرو وہ نہ کرو۔ ایسے کرو ویسے نہ کرو۔ یوں کیوں کیا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے بھلا۔ بن ج کر پتھر کی طرح بیٹھ رہنا۔ بس منہ کی ایک ٹکڑی ہے اسے دیکھ لو باقی سارا جسم کپے کی طرح پھولا ہوا ہے۔ کبھی چلے تو جیسے پیا لڑھک رہا ہو لیکن چلنے کی ضرورت بھی پڑے۔ بیٹھے بٹھائے جو سب کچھ مل جاتا ہے۔ پورمی۔

بیٹھے بیٹھے سب کچھ مل جانا کتنی بڑی لعنت ہے۔ مائی گاڈ حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ یہ سب پیسے کا اثر ہے۔ کہتے ہیں پیسہ بنا دیتا ہے۔ جھوٹ۔ یہ بناؤ ہے یا بگاڑ۔ پیسے کا بگاڑ دیکھنا ہو تو اس گھر کو دیکھ لو۔ یہ سجا سجا یا مردہ خانہ اور اس میں کفنائی ہوئی لاشیں۔

ہائیں یہ کس نے گھنٹی بجائی۔ اس وقت بھلا کون آئے گا۔ اچھا ارسلان ہے۔ بے چارا۔ اس گھر کے پھیرے لیتا رہتا ہے۔ اچھا لڑکا ہے اونچا لمبا۔ پتلا دبلا۔ فیر ہے سمارٹ ہے۔ اکیڈمیٹ ہے۔ ٹنڈر ہے۔ سب کچھ ہے لیکن تڑپ نہیں۔ چمک نہیں ارج نہیں میٹھا میٹھا ہے۔ ٹھنڈا میٹھا جیسے صندل کا شربت ہو۔ برف والا۔

ارسلان میرا منگیتر ہے۔ منگنی نہیں ہوئی۔ ویسے نامزد ہوں۔ اس عمر میں اپنا سنور چلا رہا ہے۔ ڈیڈی کہتے ہیں بڑا میلنڈ ہے۔ ہوگا۔ پر میں سنور نہیں ہوں۔ جسے چلا سکے۔ ساتھی نہیں بن سکے گا۔ کوٹ اٹھا اٹھا کر پیچھے چلنے والا ہے۔ قدم ملا کر نہیں۔ اونہوں

دراصل اس کے اندر کا بچہ مرچکا ہے۔ اونہوں مرانہیں۔ وہ تو تھا ہی نہیں۔ مرتا کیسے اندر پلے نہیں ساری بات ہی پلے کی ہے۔ میاں بیوی کھیلیں نہیں تو بات نہیں بنتی۔ ارسلان کے گھر میں تو ساری عمر ایک ہاتھ سے تالی بجاتی رہوں گی۔

ہے میرا جی چاہتا ہے کوئی مرچیلہ جوان ہو۔ کڑا کے داردونوں مل کر زندگی کا کھیل کھیلیں۔ کبھی میں اسے جیتنے میں لگی رہوں۔ کبھی اسے کہوں۔ لک ڈارنگ ڈونٹ ٹیک می فار گرائڈ۔ یو ہیو ٹو ون می اوور ایوری ٹائم۔ پر ایسا ملے بھی۔۔۔ ویسے تو کوئی ایک ملتے ہیں۔ بھوکی نظریں ڈالتے ہیں۔ چیپ باتیں کرتے ہیں۔ پتہ نہیں کیا سمجھتے ہیں۔ یہ تو کوئی طریقہ نہیں اثر ڈالنے کا۔

وہ جو کل ملا تھا۔ بس سناپ پر۔ میں جو ذرا رکی تو کھڑکی میں منہ ڈال کر بولا، ہمیں بھی لے چلو ساتھ۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ لیکن اس نے ایسی نگاہ ڈالی کہ میں جھنجھنے کے طرح بجنے لگی۔ اس کی نگاہ میں سرخ چپوئے تھے۔ تھا بڑا نڈر۔ سوہاٹ ٹائپ۔

لیکن جو ایسا مل بھی جائے تو گھر والے مانیں گے کیا۔ اونہوں۔۔۔ یہاں تو باہر والے کے لیے گنجائش ہی نہیں۔ نہ میل ملا رانہ کچھ اور۔ اپنی سیٹھ کیونٹی میں کر لو جو کرنا ہے۔ رومانس ہو افیئر ہو کچھ ہو۔ سب ٹھیک۔ چاہے کتنی دور نکل جاؤ سب چلتا۔۔۔ لیکن باہر والا۔ اونہوں۔

کیونٹی میں سب سو سو ہیں۔ پتہ نہیں کیوں۔ نہ کرارا پن نہ کڑا کا۔ نہ سوہاٹ۔ پتہ نہیں پیسہ کڑا کے کا دشمن کیوں ہے۔ رسی کا بل کیوں نکال دیتا ہے۔ پھس کر کے رکھ دیتا ہے۔ لیکن انجنا۔۔۔ انجنا کا بل کون نکالے گا۔ جل جاؤں گی پر بل نہیں نکلے گا۔۔۔ یہی بل تو زندگی ہے۔ انفرادیت ہے۔۔۔ نوٹریڈیشن انجنا کیئر ز نوٹس فار کیونٹی۔ سب توڑ دوں گی۔ چور چور کر دوں گی۔ مگر کوئی ملے بھی۔

تو بہ کسی وقت تو میں اس لڑکی کے تیردیکھ کر ڈرجاتی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے گھر میں اجنبی آگھسا ہو۔ ویسے بڑی اچھی لڑکی ہے۔ افکشنیٹ ہے۔ ہوم انیچڈ ہے۔ ڈیڈی می کا خیال رکھتی ہے۔ دل بیہوڈ ہے۔ منیر کا بڑا خیال رکھتی ہے۔ سب ٹھیک ہے بس وہ ایک نگاہ۔ ظالم نگاہ۔ اس وقت ایسا لگتا ہے جیسے اڑنے کے لیے پرتول رہی ہو۔ اس نگاہ میں نفرت نہیں ہوتی۔ اکتاہٹ ہوتی ہے۔ جیسے ہم سب سے بیزار ہو۔ سک۔ ایسے لگتا ہے مجھے جیسے کچھ کر گزرے گی۔ یہ طوفان چل کے رہے گا۔ تو بہ کوئی طوفان سا طوفان ہے جی تو ڈرجاتی ہوں۔ سہم جاتی ہوں۔

انجنا کے ڈیڈی سے بھی بات کر دیکھی۔ میں سمجھتی تھی سن کر چونک جائیں گے لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ جیسے بات سمجھی ہی نہ ہو۔ کہنے لگے مریم تو انجنا کا فکر نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ عمر ایسی ہے۔ لڑکیاں بلبلے مارتی ہیں۔ شوں شوں کرتی ہیں۔ پھر شانت ہو جاتی ہیں۔

ہے اتنے بے خبر ہیں آپ! میں نے کہا۔

وہ مسکرا دیئے جیسے کہ ان کی عادت ہے۔ بولے 'مریم تو نے اس گھر کو نہیں جانا۔ اس گھر کا جادو سرچڑھ کر بولتا ہے۔ یہ گھر ساری شوخی جذب کر لے گا۔ ساری تزپ کوڑا کولائیز کر دے گا۔ سیٹھ کے گھر میں کبھی انقلاب نہیں آتا۔ اس طرز زندگی کے تحت اڑان نہیں چلتی پرکٹ جاتے ہیں۔ یہ ہماری کمیونٹی کی ریت ہے۔ سب بل نکل جاتے ہیں۔ سانپ رسی بن جاتے ہیں۔ یہاں کوئی بغاوت نہیں کر سکتا۔ تم بالکل نہ گھبراؤ مریم ساری بات مجھ پر چھوڑ دو۔ انجنا سے کچھ نہ کہنا۔ اس کی ضد کو نہ چھیڑنا جو کرتی ہے کرنے دو۔ رکاوٹ نہ کھڑی کرنا۔ رکاوٹ بات بناتی نہیں بگاڑ دیتی ہے۔ شد دیتی ہے۔ بس دیکھتی جاؤ۔ یوں جیسے دیکھا ہی نہیں۔ جیسے دیکھنے کی کوئی بات ہی نہیں۔ سب اچھا سب اچھا۔

اتنا اوور کالنی ڈنس بھی اچھا نہیں۔ ایک دن ایسا دھچکا لگے گا کہ سمجھ آ جائے گی۔ چلو مجھے کیا ہے میں نے ہر بات کی ذمہ داری تو نہیں لے رکھی۔ وہ جو کہتے ہیں سب مجھ پر چھوڑ دو تو ٹھیک ہے۔ جو ہو پڑا ہو۔ میں کیوں فکر میں گھلی جا رہی ہوں۔ خواہ مخواہ آج وہ کاروالی پھر مل گئی۔ میں نے پہچان لیا۔

مجھے تو وہ یاد ہی نہ رہی تھی۔ ایسیاں تو کئی ملتی ہیں۔ روز کے روز۔ آج کل بڑا چاؤ ہے انہیں گاڑی چلانے کا۔ سڑک پردس گاڑیاں تو چار چلانے والے ہوں گے۔ چھ چلانے والیاں۔ میں سٹاپ پر کھڑا تھا۔ وہ آئی ذرا رکی۔ لڑکی ہو کاروالی ہوا کیلی ہو۔ رکے۔ تو بات کرنے سے کون چو کے۔ فدا پر تو عائد ہو جاتا ہے کہ کچھ کہے۔ سو میں نے کھڑکی میں منہ ڈالا اور سنجیدگی سے کہا۔ ہمیں بھی لے چلو۔ ساتھ بھر پور نگاہ ڈال دی تھی۔ بڑی تیکھی تھی۔ ایٹرکٹو۔ آج کل ساری ہی سمارٹ ہوتی ہیں۔ ایٹرکٹو ہوتی ہیں۔ لیکن اس نے تو حد کردی۔ ایسی غصے بھری نگاہ ڈالی جیسے بھڑ بھن بھن کر رہا ہو۔ واہ۔۔۔ مزا آ گیا۔ کریلا ہو تو نیم چڑھا ہو۔ کدو ٹینڈے تو بہت ہیں۔ جیسی یاد نہیں رہتے۔

ہاں تو وہ کاروالی آج پھر مل گئی۔ اتفاق سے میرے پاس مانگے کا موٹر سائیکل تھا۔ لگا دیا پیچھے۔ اتنے فاصلے پر کہ کار کے بیک ویو پر چہرہ نظر آئے پھر بھر پور نگاہ جمائی۔ مسکرا ہٹ لٹکائی۔ وہ رک گئی۔ ہم بھی رک گئے۔ کھڑکی میں منہ ڈال کر کہا۔ آپ کے مزاج اچھے ہیں۔ اس نے تلوار نگاہ سے دیکھا بولی۔ پولیس کورپورٹ کر دوں۔ میں نے کہا بعد شوق جو چاہیں کریں۔ بولی میں نے آپ کے موٹر سائیکل کا نمبر نوٹ کر لیا ہے۔ میں نے کہا نہ نہ۔۔۔ یہ تو مانگے کا ہے اپنے پاس موٹر سائیکل کہاں۔ بولی آپ بیہودہ حرکتیں کیوں کرتے ہیں۔ میں نے کہا۔ دیکھنا تو بیہودہ حرکت نہیں۔ بولی جائے کسی اور کو دیکھئے میں نے کہا۔ اور کوئی ہو بھی اس لائق۔ اس پر اس

نے گاڑی چلا دی۔ ہم نے موٹر سائیکل چلا دی۔ اس نے پیچھا چھڑانے کے لیے بڑے چکر دیئے۔ بڑے چکر دیئے۔ پھر وہ ہار گئی۔ میں بھی اسے گھر پہنچا کر آیا اور ایسا سلوٹ مارا کہ مسکرا دی۔ اس کے پاس کار ہے تو اپنے پاس بھی ایک نگاہ ہے۔ اونہوں۔ کوئی مقصد نہیں تھا۔ آرٹ فارسیک۔

اوہ۔ واٹ اے بوائے۔ بڑے گئس ہیں۔ اور پھر تڑپ ہی تڑپ۔ خالی شوخی ہی نہیں۔ متبسم شوخی۔ ذرا چیپ نہیں۔ اور حاضر جوابی ایسی کہ جواب نہیں۔ مجھے تو اس کی نگاہ کھا گئی۔ بھر پور نگاہ ڈالتا ہے تو جھمن جھمن چھڑ جاتی ہوں۔ اب تو روز ملتا ہے۔ روز جھنجھناتا ہے۔ بڑا بولتا ہے۔ بولے جاتا ہے ہنسے جاتا ہے۔ لیکن کیا مجال کوئی ایسی ویسی بات کرے۔ نگاہ سے چھیڑ دیتا ہے۔ پھر دیر تک چھڑی رہتی ہوں۔

بس دو دن اور رہ گئے ہیں پھر اس کی چھٹی ختم ہو جائے گی تو لاہور چلا جائے گا۔ وہاں کلرک ہے بے چارہ۔ ماں ہے بہن ہے سارے گھر کا بوجھ سر پر پڑا ہے۔ پھر بھی خوش خوش۔ تہقے شور شرابا۔ سوکھی زندگی کی لذت میں یوں لت پت ہے جیسے رس گلا شیرے میں پڑا ہو۔

لو وہی ہوانا جس کا ڈر تھا۔ انجنا اس لڑکے کے پیچھے لاہور چلی گئی۔ جس روز سے وہ لاہور گیا تھا ڈانواں ڈول پھرتی تھی۔ بے چین تھی۔ میں نے انجنا کے ڈیڈی سے کہا بھی۔ میں نے کہا انجنا کی سدھ بدھ ماری گئی ہے یہ ضرور اس کے پیچھے جائے گی۔ اجازت نہ دینا۔ لیکن میری بات کب مانتے ہیں۔ لڑکی نے ذرا ضد کی تو فٹ اجازت دے دی دوسرے شہر میں فلیٹ کا انتظام کر دیا۔ بولے تم آزاد ہو بیٹا بے شک لاہور میں نوکری کرو جب تک جی چاہے کرو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ساتھ نوکرانی شادو کی بیٹی رضیہ کو بھیج دیا۔ میں نے بہت سمجھایا کہ ساتھ شادو کو بھیجے وہ کم از کم خیال تو رکھے گی۔ لیکن میری کون سنتا ہے۔۔۔ بس لڑکی ہاتھ سے گئی اب وہ کہاں آئے گی۔

آ۔ واٹ اے لائف۔ اسے کہتے ہیں زندگی۔ آئی ام آن مائی اون۔ جاب ہے۔ فلیٹ ہے۔ نوکر ہے۔ اور سب سے بڑھ کر وہ ہے۔ فدا۔ وہ تو بالکل فدا ہو رہا ہے مجھ پر۔ میرے بغیر قرار نہیں آتا۔ کہتا ہے انجنا میں تولٹ گیا۔ چاروں شانے چت۔ اب کیا ہوگا۔ یار میں تو مارا گیا۔ تم ٹھنڈ کی میں ٹاٹ کا۔ تم کار والی میں پیدل۔ کہاں رانی انجنا کہاں گنگو تیلی۔ بھی اپنا مستقبل اچھا نظر نہیں آتا۔ ذرا مجھے چٹکی بھرو نا۔ دیکھو سو یا ہوں کہ جاگتا۔ بولتا جاتا ہے بولتا جاتا ہے۔ ہنستا جاتا ہے۔ میری طرف بڑبڑکتا جاتا ہے حتیٰ کہ آنکھیں ڈبڈب جاتی ہیں واہ کیا ساتھی ہے کہتا ہے۔ نہ نہ انجی تو تو مجھے بادلوں میں لے آئی اور اوپر نہ لے جا۔ کہ میرے لیے گرنا مشکل

ہو جائے۔ آخر تو گر کر ہڈی پسلی ٹوٹتی ہی ہے۔ ابھی سوچ لے نباہ سکے گی۔۔۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے چاہے کچھ ہو جائے ہم دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے۔ میں تو کب سے اس کی ہو چکی ہوں۔ اسی کی رہوں گی۔ گھر والے زیادہ سے زیادہ عاق کر دیں گے نا۔ کر دیں۔ فدا سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔

پتہ نہیں لاہور سے کیوں نہیں آئے اب تک انجنا کے ڈیڈی۔ اب تک تو آ جانا چاہیے تھا۔ اللہ کرے خیر کی خبر لائیں۔
تو بہ بڑی منتوں سے میں نے انہیں لاہور بھیجا۔ میں نے کہا لڑکی کو لاہور گئے چھ مہینے ہو گئے۔ جا کر اس کی خبر لیجئے۔ جواب میں کہتے چلو انجنا کچھ دیر اور پک نک منالے۔ لو یہ پکنک ہے۔ لڑکی ہاتھوں سے نکل گئی اور آپ اسے پکنک کہہ رہے ہیں۔ بولے پکنک ہی تو ہے۔ آ جائے گی آ جائے گی۔ گھبراؤ نہیں مریم۔ اس گھر سے کوئی نہیں جاسکتا۔ یہ ہماری ریت ہے۔ لو اب اس کا میں کیا جواب دوں۔

ہائیں۔ شاید دروازہ بجا ہے۔ کون ہے۔ اوہ آ گئے کیوں کیا خبر لائے؟ انجنا سے ملے؟

نہیں۔ سیٹھ نے جواب دیا۔

تو گئے کس لیے تھے؟ مریم نے پوچھا۔

کام سے گیا تھا۔

اور لڑکی کو ملے بغیر ہی آ گئے۔

میں اس لڑکے سے ملا تھا۔ اچھا لڑکا ہے۔ بات سمجھ گیا۔

کیا مطلب؟ مریم بولی۔

لڑکے سے بات کی سب ٹھیک ہو گیا، بے فکر رہا انجنا ایک ہفتے کے اندر اندر گھر آ جائے گی۔

خود سے آ جائے گی کیا؟

ہاں انجنا آئے گی تو خود سے آئے گی ورنہ نہیں آئے گی۔

لیکن کیسے مریم چلائی۔

لڑکے کو افسر گریڈ کی نوکری مل گئی ہے۔ بات طے ہو گئی ہے۔

مریم نے منہ میں انگلی ڈال لی۔

میں نے جو تمہیں کہا تھا اس گھر سے اس ماحول سے کوئی نہیں جاسکتا مریم۔ یہ ہماری کیونٹی کی ریت ہے۔ کوئی جائے بھی تو چند ماہ کی پک نک پر جائے گا۔ پھر از خود واپس آ جائے گا۔ از خود۔ اس گھر کا جادو اٹل ہے۔

مریم۔ یہ سیٹھ کا گھر ہے۔ فکر نہ کرو تم مریم۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

چھ مہینے کی پکنک سے کیا فرق پڑتا ہے۔

یہ پک نک تھی کیا؟ مریم غصے سے چلائی۔

تم بھی تو شادی سے پہلے پکنک پر گئی تھی۔ مریم بھول گئی کیا؟

مریم نے منہ میں انگلی ڈال لی۔ نگاہیں جھکا لیں۔ آپ کو پتہ تھا کیا۔

سیٹھ نے سر ہلا دیا۔ ہاں پتہ تھا۔ اب چائے تو منگواؤ مریم ڈار لنگ۔



باجوؤں کی ڈھونڈ

پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ نجر دھند لا گئی ہے۔ جاگتے ماں سپنے دکھیں ہیں۔ دل کو دھڑکن لگ گئی ہے۔ ڈاکدار کہے ہے، دل ماں کا ثنا لگ گیا ہے۔ لو اس عمر ماں بھلا کیسے لگے گا کا ثنا اور پھر اس گھر ماں یہاں تو آرام ہی آرام ہے۔ یوں پڑا ہوں جیسے سونے کی مکھمل کی ڈبی ماں پڑے ہووے ہے۔

یہ کمرہ جہاں رہتا ہوں، ماں انڈے کی طرحیوں چمکے ہے۔ نیچے گلچہ بچھا ہے۔ اتنی صفائی ہے کہ کھلتی ہے ایمان سے۔ کھانا ماں
وخت پر روٹی لاوے ہے۔ وخت پر ناشتہ، وخت پر چاہ، وخت پر دودھ۔ نہ ڈیننگ روم ماں جانا نہیں پڑے ہے۔

شیدے نے پہلے روج ہی کھانا ماں سے بول دیا تھا۔ دیکھو کھانا ماں بڑے چودھری صیب کا ناشتہ لٹچا ادھر لگے گا۔ بڑے صیب کے کمرے ماں اور ڈینگ روم میں لگنے سے ادھ گھنٹہ پہلے لگے گا۔ بعد ماں نہیں۔ ساتھ نہیں۔ پہلے۔۔۔۔۔ سمجھے؟

شیدابڑا کھیال رکھے ہے۔ روج آوے ہے اک وار اس کمرے ماں۔ پچھن کے لیے۔ بہووی کدی کدی آ جاوے ہے نجر آتے جاتے۔ بڑی اچھی ہے۔ سلام کرے ہے۔ پچھے ہے بابا اچھے ہیں۔ آپ مسکا کے بات کرے ہے پر چلتے چلتے۔

آج کل رواج ہی ایسا ہے۔ بہویں رکتی نہیں، پجاری کیا کریں۔ رکنے کا ٹیم نہیں ہوتا۔ اندر اتنی جان ہوتی ہے کہ رکنے نہیں دیتی۔ ہمارے جمانے ماں بھی جان ہوا کرے تھی۔ گھر والی ماں بڑی بڑی جان ہوتی تھی۔ پروہ ٹھنڈی جان ہووے تھی۔ اب تو تھی ہووے ہے۔ بڑی تھی۔ اتنی تھی کہ بھڑاس نکلے ہے۔ پہلے بھی بھڑاس ہووے تھی۔ پروے نکلے نہیں تھی۔ جلی پاتھی کی طرحیوں اوپر سے کالی سوا۔ نیچے لال انگارہ۔ اب تو لال انگارہ اوپر ہووے ہے۔ وخت وخت کی بات ہے بھائی۔ کدی مال بھتیر چھپا کر رکھیں ہیں۔ کدی باہر سجا کر رکھیں ہیں۔

سارا دن ماں اپنے بنے سجے کمرے میں ماں آرام سے پڑا رہوں ہوں۔ بس ایک تھکلیف ہے، اسان نہیں دکھتا۔ بچنے سے ایک عادت پڑی وی ہے کہ اسان دکھتا رہے۔ جو اسان دکھتا رہے تو حوصلہ رہے ہے۔ پتہ نہیں کیوں؟ ایک تو دل تنگ نہیں ہووے ہے۔ دو بے جندگانی بند بند نہیں لگے ہے۔ پھر یہ بھی کہ اسان دکھے ہے تو اسان والا بھی دور نہیں لگے ہے۔ جیسے نیڑے نیڑے ہو۔ پاس ہو ساتھ ہو۔ اک تسلی سی رہے ہے۔ جندگی میں کیا چاہیے، بس اک تسلی اور کیا۔

اس کمرے میں ماں اسمان نہیں دکھے ہے۔ بس یہی اک تھلیف ہے۔ بڑی تھلیف ہے پھر درو جے ہیں۔ ساری عمر کھلے درو جوں
ماں بتائی۔ پر اس کمرے کے درو جے بند ہی رہے ہیں۔ کھلتے تو ہیں پر کھل کے نہیں دیتے۔ پھٹ سے بند ہو جاویں ہیں آپ ہی
آپ۔ پھر درو جوں پر پردے پڑے رہیں ہیں۔ یہ سیسے کا ہے۔ یہ جالی کا، یہ گرل کا، یہ کپڑے کا۔ پردے ہی پردے، پردے ہی
پردے۔ بھلا اسمان کیسے نجر آئے۔ بس جمین ہی جمین دکھے ہے۔ وہ بھی سچی کچھ والی۔ مٹی والی دھرتی نہیں دکھتی۔ بوٹے نہیں دکھتے۔
ویسے بوٹے تو بہت ہیں بنگلے ماں۔ وہ بھی طرحاں طرحاں کے۔ یرسہی بناوٹی، گملوں والے، دھرتی والے نہیں۔

چلو آسمان نہیں دکھتا تو سہی۔ اتنی سی بات سے کانٹا تو نہیں لگتا نادل ماں۔ پھر ڈاکدار کیوں کہے ہے کانٹا لگ گیا ہے۔ بھیا، کانٹا تو دکھ میں لگے ہے سکھ ماں تو نہیں لگے۔ ماں تو یہاں سکھ میں پڑا ہوں۔ سمجھ کر لو جس طرحیوں گرمی بادام میں پڑی ہووے ہے پھر کانٹا کیسا؟

ہاں ایک بات جرور ہے، نجر دھند لاگنی ہے۔ منے یہ بات ڈاکدر کو نہیں بتائی جو بتا دیتا تو وہ پچھتا۔۔۔۔۔ پتہ نہیں کیا پچھتا۔ ویسے بھی ماں باجوؤں کی بات تو بتا بھی دیتا تو کیا وہ سمجھ لیتا۔ ماں تو کھد نہیں سمجھ پایا باجوؤں کی بات کو۔ پھر بھلاو سے کیسے سمجھاتا۔ منے تو اپنے پترشیدے سے نہیں کری بات۔ بھلا یہ بتاؤ جس بات کا نہ سر ہونہ پیرؤ سے کون سمجھائے کون سمجھے۔

اور کوئی سمجھے بھی کیسے باجوؤں کی بات۔ باجوؤں کا تو جمانہ ہی نہ رہا۔ وہ تو کد سے کھتم ہو گیا۔ اب تو باجوؤں نے روپ ہی بدل لیا ہے۔ وہ تو گلے کا ہار بنے وے ہیں۔ اب وہ پرانے جمانے کے باجو کہاں۔ اب تو کھالی جسم رہ گیا ہے۔ ٹیکھا، قز او۔ یوں جیسے تیر کمان یہ چڑھا ہو۔ اب چھوٹا کہ اب چھوٹا۔

یہ جب اور اب کا جھگڑا سدا کا ہے بھائی۔ ہمیشہ جب جب رہا اور اب اب۔ نہ کدی جب اب ہوا نہ اب جب۔ دونوں ماں پھلائی رہا۔ اب تو یہ پھلا روج بروج بڑھتا ہی جاوے ہے۔ دناں ماں صدیاں کا پھر ق پڑتا جاوے ہے۔

ہاں تو خنجر کی بات کر ریا ماں۔ اپنی خنجر دھندلائے کچھ زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی۔ یہی چار ایک بھٹتے ہوئے ہوں گے۔ نہیں بھئی دیکھنے ماں تو پھرق نہیں آیا۔ سب کچھ دکھے ہے۔ ٹھیک ٹھاک دکھے ہے۔ کمرے کی تالکیاں دکھیں ہیں۔ درو جے دکھے ہیں۔ پردے دکھیں ہیں۔ کوچنگ دکھے ہیں۔ میج دکھے ہے۔ سب چیخیں دکھیں ہیں۔ صاف دکھیں ہیں کوئی چیخ نہیں دھندلائی۔ صرپھ نظر دھندلائی ہے۔ یوں کہ کھانکھواہ کی چیخیں دکھنے لگی ہیں۔ وہ بھی بہتی نہیں صرپھ دو باجو۔

دو باجو میرے کمرے ماں گھس آئے ہیں۔ وہ میرے آسے پاس یوں گھومیں پھریں ہیں جیسے سریت کی بوتل کے گرد دکھیاں۔

پہلے دناجد میں نے باجوؤں کو دیکھا تو ماں گھبرا گیا۔ ایمان سے رت کا وخت تھا۔ بشیر اکھانساں آیا۔ و سنے روٹی میج پر رکھ دی۔ اس وخت کھانے کو جی نہیں چاہے تھا۔ منے سوچا، چلو کھالو۔ چودھری فضلے دو برکیاں۔ پھر ارام سے حقہ پیوں گا۔

حقہ مجھے بہت پیارا ہے۔ سمجھ کر لو یہی اک ساتھی رہ گیا ہے پرانے دناں کا۔ میرے پاس بیٹھ کر رات گے توڑی مجھ سے باتاں کرتا رہے ہے۔ اپنی کہے ہے۔ میری سنے ہے۔ گھر ماں کسی کو میرا حقہ پسند نہیں۔ کھاناں اسے ہاتھ نہیں لگائے ہے۔ ماں کھد ہی تاجا کروں ہوں۔ کھد ہی چلم پھروں ہوں۔ بہو تو کہے ہے۔ ہئے، بو، بو، بو، لے جاؤ اسے یہاں سے، مجھے نخر نے آئے۔ شیدے نے منہ کھول کر کدی نہیں کہا کچھ۔ آنے بہانے بہت کچھ کہا۔ کہنے لگا، بابا سگریٹ کا بڑا ڈبہ منگوادوں، کدی حقہ نہ بھرا، سگریٹ پی لیا۔ اک روج وہ لے بھی آیا بڑا ڈبہ جس ماں ڈبیاں تھیں۔ میرے کمرے میں میں چھوڑ گیا و س۔ مہینہ بھر پڑا رہا یہاں جوں کا توں بند کا بند۔ منے منہ نہ لگا یا۔ کیسے لگا یا؟ بھائی کہاں گونگا چرٹ کہاں باتاں کرنے والا حقہ۔ ماں اپنے اپنے دکھ سکھ کے ساتھ کو کیسے چھوڑ دیتا بھلا۔ ایک ہی تو ساتھی ہے اپنا اس بھرے گھر میں۔

ہاں تو میں اس روج کی بات کر رہا تھا، منے سوچا، چودھری فضلے کھالے دو برکیاں۔ پھر ارام سے بیٹھ کر حقہ پیئیں گے۔ لوجی ماں میج پر جا بیٹھا۔ روٹی والا رومال کھولیا۔ پتہ نہیں دو باجو کہاں سے تیرتے وے آئے۔ اک باجو کا ہتھ کھلا اور وں نے پلپلیاں سے روٹی اٹھا کر میرے ہتھ تھادی۔ ماں تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ حریان۔ پھر دو باجو میرے آسے پاس ہی رہے۔ بوٹی کھانے لگا تو دو انگلیوں نے پکڑ کر سامنے رکھ دی۔ پانی پینے لگا تو لگا اس ہتھ ماں پکڑا دیا۔ ماں تو حریان۔ یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

بس اس روج سے آج توڑی یہی ہو رہا ہے۔ دن رات اندھیرے سویرے، سر بھارا بھارا ہو تو انگلیاں پڑ پڑیاں سہلاویں ہیں۔ تھکاوٹ ہو تو ہاتھ پنڈلیاں دباویں ہیں۔ اٹھتا ہوں تو باجو سہارا دیویں ہیں۔ کھاٹ سے اٹھوں تو جو تا سامنے رکھ دیویں ہیں۔ دروجہ کھولیں ہیں۔ قدم قدم پر سنبھالا دیویں ہیں۔

پہلے تو ماں سمجھا سٹھیا گیا ہوں۔ بہن گڈمڈ ہو گیا ہے۔ نخر تما سے کھیل رہی ہے۔ پھر سوچ سوچ کر ماں نے کہا۔ چودھری فضلے یو بات نہیں، نہ تو جہن دھندلایا ہے نہ نخر۔ یہ کچھ اور ہی بات ہے۔ سوچتا ریا، دیکھتا ریا۔ باجو چنے نہیں، گورے نہیں، بدامی ہیں۔ بھرے بھرے سوکھے نہیں۔ بنے سچے نہیں جیسے آج کل ہوویں ہیں، نہ رنگدار نہ ریسیمیں نہ ملیم۔ پر ہیں صاف ستھرے۔ درستی نہیں کامی ہیں۔ انگلیاں یہ موٹی موٹی ہیں، بھنڈیوں کی طرحیوں نہیں، نہ کولیاں نہ تگی پتنگ۔ نخون بڑھے وے نہیں چھریوں کی طرحیوں۔ کٹے وے ہیں۔ رنگ دار نہیں ساد مرادے ہیں۔ یو باجو آج کل کے باجو نہیں۔ چھیڑتے نہیں، سنبھالتے ہیں۔ ڈولتے نہیں، سہارا دیویں

ہیں۔ دکھنے والے نہیں کامی ہیں۔ تو بھائی ماں دیکھتار یا دیکھتار یا۔

کدی کدی لگتا جیسے جانے پچھانے ہوں۔ دیکھن ماں نئے پرورتن ماں جانے پچھانے۔ میرے آسے پاسے ہوا ماں تیریں ہیں
توان جانے دکھے ہیں۔ سرد باویں ہیں۔ سہارا دیویں ہیں تو جانے لگیں ہیں۔
پھر اک دن بھید کھل گیا۔

میری نجر باجو کی کنی پر جا پڑی۔ پھوڑے کا اتنا انسان۔ ارے یو تو سگو کے باجو ہیں۔ پھر ماں سوچن لگا۔ چودھری فضلے یہ جو تجھے دن رات سگو کے باجو دکھنے لگے ہیں۔ کیا تجھے وس سے موحوبت تو نہیں ہو گئی۔۔۔۔۔۔ پھر ماں کھد ہی ہنس پڑا۔ یہ موحوبت کی بات بھی ایک رہی۔ چودھری فضلے جندگی کے تہیہ ورے تو نے سگو کے ساتھ گجار دیئے۔ تہیہ ورے۔ پر تجھے وس سے موحوبت نہ ہوئی اور اب جدا سے مرے وے پنچ ورے ہو گئے ہیں اب کیا تجھ وس سے موحوبت ہو گئی ہے۔ اس پر ماں اتنا ہنسا اتنا ہنسا کہ آنکھوں ماں آنسو آ گئے۔

اور پھر سگو سے موحو بت۔ سگو سے کیسے موحو بت ہو سکے ہے بھلا۔ سگو تو باجو ہی باجو تھی۔ خالی باجوؤں سے کون موحو بت کر سکے ہے بھلا۔ اس اللہ کی بندی نے نہ کدی منہ کی ٹکڑی سجاتی نہ لٹکانی نہ ہی سامنے دھری۔ منہ بھی کدی منہ کی طرح دھیان نہ دیا۔ ویسے سگو کا منہ بھی تھا اور جو بنا تو بڑے جور کا تھا۔ ٹیکھا۔ کانٹے کی طرحیوں چھنے والا۔ چھیل دیوے تھا۔ پروسنے اسے موٹی چدر ماں ہی لپیٹے رکھا۔ ہمیش یوں جیسے چوری چوری کی چیچ ہو۔ ورنہ تو سب کچھ ہی لپیٹے رکھا سب کچھ۔ بس ایک باجو ہی کھلے چھوڑ رکھے تھے۔

سارا دن و سکے باجوؤں سے بھرا رہتا تھا۔ ادھر وہ کپڑے دھو رہے ہیں۔ ادھر بھانڈے مانج رہے ہیں۔ پھر دیکھو تو جلتے تنور میں لٹکے وے ہیں۔ چاٹی کے گرد گھوم رہے ہیں۔ آٹا گوندھ رہے ہیں۔ بلوہنی سے چھنے وے ہیں۔ مجھ دوہ رہے ہیں۔ گتاوا کر رہے ہیں؛ سچی بنا رہے ہیں۔ ماں کھیت ماں بیٹھا روٹی کھا رہا ہوں۔ وے پکھا کر رہے ہیں۔ ماں حقہ پی رہا ہوں؛ وے ٹوپی ماں تاجہ انگارے رکھ رہے ہیں۔ ماں تھک گیا ہوں؛ وے مٹھیاں بھر رہے ہیں۔

تبیہ ورے میرا گھرانہ باجوؤں سے بھرا رہا۔ اور صرچھ گھر ہی نہیں، میرے کھیت ماں بھی وہ بوٹوں کی طرحیوں لہلہاتے رہے۔
سگوماں جنانی بھی تھی یونہیں کہ کھالی باہاں ای باہاں تھیں۔ یوں سمجھ کر لو کہ وہ آ لوکا بوٹا تھی۔

جنانی بھیترتھی۔ باہر باہیں اہلہامیں تھیں۔ آج کل کی جنانی تو دھنیا ہووے ہے۔ سب باہر ہی باہر اور پھر دور دور تک مشک

مارے ہے۔ وخت وخت کی بات ہے بھائی۔ کدی مشک لکونے کا جمانہ کدی مشک مارنے کا۔

کدی کدی سگو کی جنانی بولا بھی کرے تھی۔ اکھ سے اکھ ملا کر نہیں جھکی نجر سے چلتے چلتے۔ کہتی رے بہت بھارا ہو گیا ہے میرا پنڈا۔ اسے ہولا کر دے۔

کدی کدی کہے تھے یو بات۔ دو چار مہینوں ماں اک ادھ واری۔ کدی ماں کہہ دیتا ہنس کر رری تو بھاری ہو رہی دکھے ہے اور وہ مسکا کر نجر نیچی کر لیتی۔

ہمارے وہ پہلے پہل کے دن کٹھن تھے۔ ماں بھی لٹا پٹا کیلا پلاں والے پہنچا تھا۔ وہ بھی روئی روئی رلی وی بے سہارا پتہ نہیں کہاں سے آئی تھی۔ تقدیر نے جوڑ ملا دیا۔ گاؤں کے چودھری نے تھوڑی سے جمین دے دی۔ اک ٹوٹا پھوٹا گھر دے دیا۔ پھر ماں مل پر جت گیا۔ وس نے باجو نکال لیے۔ جتنی ویڑے کی دھریک نے ٹہنیاں نکالیں، وتی سگو نے باہیں نکالیں۔ دھریک نے ویڑے پر چھاؤں کر دی۔ گھر میں سگو کے باجوؤں نے لہر بہر کر دی۔ کھیت ماں پیدا بڑھی تو مجھ لے لی۔ گھر ماں دودھ دہی کی دھاراں چلنے لگیں۔ وسنے صر پھ ایک پتر دیا شیدا۔ وہ بھی اتنا لبق فیت کہ جس مدر سے ماں گیا، وجیفہ لیا۔ ماسٹر نے کہا، چودھری تیرا پتر بڑا صیب بنے گا۔ سو بن گیا۔

پھر بھی وہ پہلے پہل کے دن بڑے کٹھن تھے۔ جو سگو کے باجو پتو ار نہ بنتے تو ناؤ ڈولتی رہی رہتی، پار نہ لگتی۔ بڑی اونچ نیچ دیکھی ان دنوں۔ بڑی جورا جوری کرنی پڑی۔ پر اب ماں سوچوں ہوں کہ مشکل کے دن آرام کی دنوں سے اچھے ہو ویں ہیں۔ اونچ نیچ کی لہریں چلتی رہیں تو جندگی ماں حرکت برکت رہے ہے۔ کھالی آرام تو لو ہے کو بھی جنگ لگاوے ہے۔

ان دنوں جد ماں سام کے وخت اسمان تلے بیٹھ کر حقہ پیتے وے کھیت کو دیکھتا تو جی کھش ہو جاتا۔ گھر کو تو سگو کے باجوؤں نے میرے لیے تخت بنا رکھا تھا۔ اور میری پگڑی پر طرہ لہرا رکھا تھا۔ اتنی عبت تھی گاؤں ماں۔

کدی کدی اسمان تلے بیٹھے وے اوپر سے اک اواج سی آتی۔ چودھری فضلے کچھ اور چپے تو مانگ لے اور ماں ہنستا۔ کیوں کھول کرے ہے رے۔ باجوؤں کے تخت پر بٹھا دیا۔ پگ پر طرہ لہرا دیا۔ پتر کو بڑا صیب بنا دیا۔ اب اور کیا مانگوں۔

پھر اک دن بیٹھے بٹھائے سگو پھوت ہو گئی۔ کلیجے ماں پیڑ اٹھی۔ باہیں اٹھا کر بولی۔ رے پکڑ لے رے مجھے۔ پہلی بار دونوں باجو میرے گلے میں ڈال دیئے کھلے بندوں۔ پھر اک ہچکی لی اور ٹھنڈی ہو گئی۔ پھر شیدا گاؤں آیا۔ ماں کو وہیں پلاں والے ماں دفنایا اور مجھے جبر دتی ادھر لے آیا۔ اپنے بنگلے ماں۔

کھل بندھنا

مندر کے احاطے سے گزرتے ہوئے سیوا کارن، بانورے کو بڑکے درخت تلے بیٹھا دیکھ کر رک گئی۔ بولی ”ارے تجھے کیا ہوا جو یوں ہانپ رہا ہے تو؟“

بانورے نے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ بولا ”سیوا کارن سامان اٹھاتے اٹھاتے ہار گیا۔“

”کیسا سامان رے؟“ سیواکارن نے پوچھا۔

”اب کی یورن مشی میں اتنی ساری چاتریاں آئی ہیں کہ حد نہیں۔“

”چالیس سے اوپر ہوں گی۔ ان کا سامان۔۔۔۔۔“

”چالیس سے اوپر۔۔۔۔۔؟“ سیواکارن نے حیرانی سے دہرایا۔

”ہاں دیوی“ وہ بولا ”سب کچی عمر کی ہیں۔ لڑکیاں ہی لڑکیاں۔ پکی عمر کی بس چار ایک ہوں گی۔ پروہ بھی لڑکی سامن دکھتی ہے۔ مجھے تو یوں لگے ہے جیسے سارا کالج ہی ادھر آ گیا ہو۔“

یہ سن کر سیوا کارن سوچ میں پڑ گئی۔ جیسے چپ لگ گئی ہو۔ پھر بولی ”تپسنی مہامان کا کہنا سچ ہو رہا ہے۔ وہ کہتا کرتی تھی، سیوا کارن کلجگ میں نہ استری رہے گی نہ ناری۔ صرف لڑکیاں رہ جائیں گی، ابلائیں۔ پھر ممتا کا دھارا سوکھ جائے گا۔ ناتے ٹوٹ جائیں گے۔ پرش اور ناری کا فرق مٹ جائے گا۔ ایک کو دوسرے سے پرکھنا مشکل ہو جائے گا۔“

”ہاں یہ تو ہو رہا ہے۔“ بانورے نے دلی زبان سے کہا۔ ”پر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آوے ہے۔“

”وہ کیا؟“ سیواکارن نے پوچھا۔

”وہ یہ کہ ایک دم سے دیوی کھل بندھنا کی لگن کیسے لگ گئی۔ یہ کالج والیوں کو کیا ہوا کہ دیوی کے چرن چھونے آ گئیں۔ انہیں نہ تو دیوی پر دشواری ہے نہ دیوتا پر۔ پورن ماشی پر بس پانچ چھ آچا کر تھیں۔ اب کے چالیس کیسے آ گئیں؟ بے بھگوان یہ کیا بھید ہے

66

سیواکارن مسکرائی۔ بولی ”بھگوان کے بھیدوں کو کس نے جانا ہے بانورے۔“

سیوا کارن جانے لگی تو مائی بھاگی دوڑی آئی۔ بولی ”دیوی کے چاتری بہتے ہیں اور مندر کی کوٹھڑیاں کم۔ انہیں کیسی ٹھکانہ دوں؟“

”جیسے کیسے پورن کر دے بھاگی۔“ سیوا کارن نے جواب دیا۔ ”بس ایک بات کا دھیان رکھیو کہ مندر میں کوئی نہ سوئے اور تپسنی مہمان کی کوٹھڑی میں کوئی پاؤں نہ دھرے۔“

”وہاں کون پاؤں دھر سکتا ہے بھلا؟“ بانورا بولا ”مہمان کی کوٹھڑی تو سدا بند رہتی ہے۔ اندر سے کنڈی لگی رہتی ہے۔“

سیوا کارن پھر سوچ میں پڑ گئی۔ اسے چپ لگ گئی۔ دیر تک مائی بھاگی اس کا منہ تکتی رہی۔ پھر سیوا کارن گویا اپنے آپ سے بولی ”ہاں کنڈی کا بھید نہ جانے کب تک رہے گا۔ جیون بھر تپسی مہمان نے اندر سے کنڈی لگائے رکھی۔ پھر جب مرن بعد اس کی اترھی اٹھانے گئے تو دیکھا کہ پھر اندر سے کنڈی لگی ہوئی ہے۔“

”کیا کہا، مرن کے بعد اندر سے کنڈی کس نے لگائی؟“ بانورہ بولا۔

”کون جانے“ سیواکارن نے مدھم آواز میں خود سے کہا ”گرود یو کا کہنا ہے کہ تھپسی مہامان کے مرن جیون کا بھید آج تک نہیں کھلا۔“

”ہے بھگوان“ بھاگی نے ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لیے۔

سیواکارن نے کہا ”پرنتو جوتش والوں کو کہنا ہے کہ کلجگ میں کسی پورن ماشی کو یہ بھید ضرور ملے گا، کھل کر رہے گا۔ گرو دیو کہتے ہیں ہاں مہمان کے ابھاگ کا چکراک دن ضرور ٹوٹے گا۔ پھر اسے شانتی مل جائے گی۔“

[illegible]

”ہائیں یہ کیسے بول ہیں؟“ بانورہ بولا ”جو دیوی بندھن کے کھولے ہے۔ اس کے چرنوں میں بیٹھ کر بندھ دے کی پرارتھنا کرنا۔ ہرے رام، ہرے رام، ہرے رام۔“

سیواکارن کو پھر چپ لگ گئی۔

اس وقت سورج مغرب میں یوں غروب ہو رہا تھا جیسے مندر پر رنگ پچکاریاں چلا رہا ہو۔ مندر کے پرلے سرے پر گھنے بوہڑ کے درخت کے لمبے سائے میں بیٹھا شام مراری بانسری پر کلیان بجا رہا تھا۔ بادلوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ دوران پورنا کے گاؤں میں چکی کراہ کراہ کرتا دل دے رہی تھی۔ عین اس سے مندر سے کھڑکھڑہنسی کی آواز سنائی دی۔

وہ سب چونک اٹھے۔ ”ہائیں یہ کیا؟“

”یہ کیسی آواز ہے؟“ سیواکارن نے پوچھا۔

”یہ چاتری ہیں۔“ دیوی بھاگی بولی۔ ”دیوی کھل بندھنا کے چرنوں میں بیٹھ کر گیان دھیان کی بجائے ہنس بول رہی ہیں۔“

بانورہ ہنسا کہنے لگا۔ ”ان آج کل کی چھو کر یوں کو کیا پتہ کہ دیوی کیا ہووے ہے۔ بندھن کیا ہووے ہے۔ جیون کیا ہووے ہے۔“

مندرسے ہنسی کا ایک اور ریلا اٹھا۔

کائنات کا منہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ بولی ”یہ ہنسنے کی بات نہیں، رونے کی ہے۔ یہ سارے شہد دیوی، رانی، استری، شریعتی۔“ عورت،
وومن سب جھوٹے ہیں۔“

”تو پھر سچا لفظ کون سا ہے؟“ کو شلیا نے پوچھا۔

کامتا بولی ”میری طرف دیکھو۔ میں نہ دیوی ہوں، نہ شرمیلی ہوں، نہ دو من ہوں۔ میں اک بانندی ہوں بانندی۔ اے سلیو صرف میں ہی نہیں تم ہم سب۔ وی آر آل سیلوز۔۔۔۔۔ سیلوز۔“

”سچ کہتی ہے۔“ کنول بولی ”ہم سب اپنے ماسٹر کا دل خوش کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ ہم اپنے مالکوں کو خوش وقتی دیتی ہیں۔ اے مومنٹ آف جائے۔ اے مومنٹ آف اکسائٹ منٹ۔ ایک لذت کا لمحہ وقتی چٹخارہ اور بس۔“

”نہ ابدلہ ایسا نہ کہو۔“ دیہاتن بولی ”ناری داسی نہیں، مالکن ہوتی ہے۔“

”کھی کھی کھی“ کنول تمسخرے ہنسی۔

”مجھے بتا تو وہ کون عورت ہے جو اسی نہیں بلکہ مالکن ہے؟“ کانٹا نے پوچھا۔

”میں ہوں۔۔۔۔۔ میں۔“ دیہاتن نے فخر سے سراٹھا کر کہا۔ ”میں اپنے پتی کے من پر راج کرتی ہوں۔ مسکا کر دیکھوں تو وہ لہلہا اٹھے۔ گھوری دکھاؤں تو مر جھا کر پڑے۔ سوکھے جائے۔“

”جوا ایسا ہے۔۔۔۔۔“ کا نتانہ غصے سے کہا۔ ”تو تو کھل بندھنا دیوی کی بوری ماشی میں جھک مارنے آئی ہے کیا؟“

”یہاں تو بندھن کھلوانے آتے ہیں۔“ کوٹلہا نے وضاحت کی۔ ”تو کون سا بندھن کھلوانے آئے ہے۔“

”سچ کہو! سچ کہو ہو۔“ دیہاتن نے جواب دیا۔ ”میرے بھاگیہ کی گانٹھ پتی کے من میں نہیں پڑی۔ ساس کے من میں پڑی ہے۔ وہ ہمیں دیکھ نہیں سکھاوے ہے۔ جتنا پتی چاہے ہے اتنا ہی ساس جلے ہے۔ بس گھولے ہے۔ اپنے پتر کو مجھے راسن کر کے دیوے ہے۔ ادھر وہ تڑپے ہے ادھر میں تڑپوں ہوں۔ سچ میں ساس دیوار بن کر کھڑی رہے۔ بس یہی میرے نصیبے کا بندھن ہے۔ کیا پتہ اس پورن

ماشى ميں ديوى كھل بندھنا ميرايہ بندھن كھول دے۔“ وہ ہاتھ باندھ كراٹھ كھڑى ہوئى۔“ بے ہود ديوى كھل بندھنا كى۔“

”كھى كھى كھى كھى۔“ كنول ہنسى۔“ بھولى عورت يہ جو ساس نندہيں يہ تو پتى كے ويہڑے كے چاندہيں۔ ان كى اپنى روشنى نہيں۔ مانگے كى ہے۔ پتى مہاراج كى دين ہے۔ سارا چيتكار سورج مہاراج كا ہے۔ چاہے تو ساس كا چاند چكا كر بہو كے سر پر لڑكا دے۔ چاہے تو نند كا بانڈا جلا كر بھابھو ج كى آنكھيں چندھيا دے۔“

”سچ كہتى ہو۔“ سدرى بولى ”سب كھيل مدارى كا ہے۔ چاہے تو بندر يا نچا دے۔ چاہے تو ميناسے ٹيں ٹيں كرا دے۔“

كانتا سنجيدہ ہو كر بولى ”پگلى ساس نند تو پتلياں ہيں۔ پتى ديوى كے ہاتھ ميں ڈورى ہے جسے چاہے نچا دے۔ بھارے مات پتا كا كيا دوش۔“

”مات پتا۔۔۔۔۔۔“ سیتے كے ماتھے پر گھورى تن گئى۔“ سكھيو عورت كا كوئى بھى اپنا نہيں۔ نہ بھائى بہن نہ مات پتا۔ يہ وہ ناؤ ہے جس كا كوئى پتوار نہيں۔ بس ڈولن ہى ڈولن ہے۔ جيون بھركا ڈولن۔“ يہ كہتے ہوئے اس كى آنكھوں ميں آنسو آ گئے۔ پھر ايك ہچكى نے اس كى بات كاٹ دى۔

”تيرى پتا كيا ہے رى؟“ سدرى نے پوچھا۔

”مت پوچھ۔“ شكنتلے چينى ”دكھيا كونہ چھيڑ پھوڑے كو ہاتھ نہ لگا۔“

”ميرى پتا۔“ سیتے گنگنائى۔ ”میں اك بكا و مال ہوں۔ مات پتا مجھے دوبار بچ چكے۔ اب تہى بار كے داؤ ميں بيٹھے ہيں۔ پہلے بچتے ہيں پھر بسنے نہيں ديتے كہ پھر سے بچ سكيں۔“

سیتے اٹھ بيٹھى۔ دونوں ہاتھ جوڑ كر مورتى كے سامنے كھڑى ہو گئى۔ بولى ”ہے كھل بندھنا ديوى پتا۔ كيا ميرے بھالگيہ ميں بكنا ہى لكھا ہے۔ بول جو ايسا ہى ہے تو بتا كہ ميں خود اپنے كو بيچوں۔ روج كے روج بيچوں۔ مجھے يہ دكھ تو نہ رہے كہ مات پتا اپنى پيٹ جائى كو بكا و مال بنائے بيٹھے ہيں۔“

كنول اٹھى اس نے سیتے كو كاواوے ميں بھر ليا۔ بولى ”جى برانہ كر بہنا“ اك تو ہى نہيں ہم سب بكا و مال ہيں۔ كوئى خود كو اك ہى مرد كے ہاتھ روز كے روز بچتى ہے كوئى رنگ رنگ كے پرش كے ہاتھ بكتى ہے۔“

”كيا فرق پڑتا ہے؟“ كانتا نے كہا۔ ”ايك كے ہاتھ بار بار بكو يا ہر رات نئے گا ہك كے ہاتھ بكو۔ بكنا ہمارا بھالگيہ ہے۔ كتنا بڑا بندھن ہے۔“

”صرف ایک نہیں، بندھن ہی بندھن ہیں۔“ کنول غصے سے چلائی۔

”اٹھو بہنا سب بندھن توڑ دو۔ اپنی ہمت سے توڑ دو۔“ شکنتلے چلائی۔

”ایک بھی باقی نہ رہے۔ یہ پتھر کی دیو کھل بندھنا بے چاری کیا کرے گی۔“

”ہوش کروڑ کیو! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔“ مائی بھاگی بات کئے بغیر نہ رہ سکی۔

”مندر میں کھل بندھنا کے چرنوں میں بیٹھ کر تم پورن ماشی سے ایک رات پہلے دیوی کے خلاف اپنے من میں بس گھول رہی ہو۔“

”کیوں نہ بس گھولیں۔“ کاٹا بولی ”ہم تو دیوی کے پاس صرف اس لیے آئی ہیں کہ پروٹسٹ کریں۔ کیا دیوی کو نظر نہیں آتا کہ

بندھنوں نے عورت کا بند بند لہو لہان کر رکھا ہے۔ کیا عورت سارے بندھنوں سے کبھی آزاد نہ ہوگی۔“

”نہ نہ نہ نہ“ بھاگی کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکلیں۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا۔ خوف کے مارے آنکھیں باہر نکل

آئیں۔ ”نہ نہ نہ نہ“ وہ بولی۔ ”دیوی سے ایک بندھن کھولنے کی منت کرو۔ کوئی ایک بندھن۔ پرنتو وہ باہر کا بندھن ہو، بھیتیر کا نہیں۔ جو

تم نے سارے بندھن کھولنے کی پرارتھنا کی تو۔۔۔۔۔ نہ نہ نہ ایسا نہ کرو۔ جو دیوی نے تمہاری سن لی تو۔۔۔۔۔ تو کیا ہوگا؟“

ایک ساعت کے لیے سب ڈر گئیں۔

”کیا مطلب؟“ کنول نے ہمت کر کے پوچھا۔

”جو باہر بھیتیر کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تو۔۔۔۔۔ بھاگی نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

”ٹوٹ گئے تو۔۔۔۔۔؟“ سبھی بوکھلا سی گئیں۔ ”تو کیا؟“

”تو تم بھی مہمان کے سامان ہو جاؤ گی۔“ بھاگی رک گئی جیسے اس کے گلے میں آواز نہ رہی ہو۔

”مہمان کے سامان۔“ سب نے دہرایا

یعین اس وقت سیوا کارن کی آواز سنائی دی۔ ”بھاگی۔۔۔۔۔“

آواز سن کر بھاگی جیسے جاگ اٹھی۔ طلسم ٹوٹ گیا۔ شرمندہ سی ہو گئی۔ دانتوں میں زبان دیئے بھاگی۔ اس کے جانے کے بعد کچھ

دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر کنول بولی ”یہ کون تھی؟“

”کوئی مندر کی ہے۔“

”کیا کہہ رہی تھی؟“

پتہ نہیں کیا کہہ رہی تھی۔“

”بے جوڑ باتیں کر رہی تھی۔“

دیہاتن بولی ”کہہ رہی تھی اگر دیوی نے تمہاری مانگ پوری کر دی۔ سارے بندھن کھول دیئے تو پھر کیا کرو گی۔“

”نان سنس“ کا نتانے ناک چڑھائی۔

”مجھے یہ مندر وندر دیوی دیوی۔ سب پا کھنڈ معلوم ہوتا ہے۔“ پیلی ساڑھی والی پہلی مرتبہ بولی۔

”جو ایسا ہے تو یہاں کیوں آئی ہو؟“ کنول نے پوچھا۔

”چاندی کے رے کو کھلتے دیکھنے آئی ہوں۔“ پیلی ساڑھی والی نے کہا۔

”کیا واقعی رسہ کھلتا ہے؟“

”کہتے ہیں یوں تار تار ہو جاتا ہے جیسے دھو کر سوکھنے کے بال بال کھلتے ہیں۔“

پیلی ساڑھی والی انھی بولی۔ ”سب پا کھنڈ ہے نہ پرارتھنا سے کچھ ہوگا نہ ماتھا ٹیکنے سے۔ نہ منتوں سے۔ اگر اس سدا کی غلامی سے

نجات پانا ہے تو اٹھو جدوجہد کرو۔ جان لڑا دو ورنہ اس مرد کی دنیا میں عورت کا کوئی مقام نہیں۔“

”بالکل بالکل“ چاروں طرف سے شور مچ گیا۔

شہر سے دور شاہراہ سے دور شوالک پہاڑیوں میں کبھی ہوئی پگڈنڈیوں کے بیچ درختوں سے گھرا ہوا ایک گاؤں ہے۔ ان پورنا

۔۔۔۔۔ اس گاؤں سے ایک میل جنوب کی طرف ایک کھلا میدان ہے جس کے درمیان میں ایک بہت پرانا مندر ہے جسے کھل

بندھنا کا مندر کہتے ہیں۔ یہ مندر اتنا پرانا ہے کہ کسی کو پتہ نہیں کہ کب تعمیر ہوا۔ اس کی بناوٹ بھی مندر کی سی نہیں۔ نہ مندر کا مخروطی گنبد

نہ کلس۔

صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک بہت بڑا ہال کمرہ ہے جس کی چھت نیچی ہے۔ ہال کمرے کے درمیان میں ایک

چبوترے پر پتھر سے بنا ہوا قد آدم دیوی کا مجسمہ ہے جس کے خدو خال وقت کی خرد برد کی وجہ سے گھسے پٹے ہوئے ہیں۔ صرف

آنکھیں واضح ہیں جو لمبی اور ترچھی ہونے کی وجہ سے یوں ڈولتی محسوس ہوتی ہے جیسے کشتیاں ہوں۔ دیوی کے قریب ہی ایک موٹا سا

چاندی کا رسہ چھت سے لٹک رہا ہے جو چاندی کی پتلی پتلی تاروں کو بات کر بنایا گیا ہے۔

ہال کمرے کے ارد گرد تینوں طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ جن کے ارد گرد ایک چھوٹا سا برآمدہ چاروں طرف گھومتا

ہے۔ دیکھنے میں ایسا لگتا ہے جسے وہ مندر نہیں بدھ مت کے پجاریوں کا پاٹ شالہ ہو۔

پرانے زمانے سے یہ پتھر کی بنی ہوئی عمارات دیوی کھل بندھنا کے مندر کے نام سے مشہور ہے۔ کسی کو علم نہیں کہ دیوی کا اصل نام کیا ہے۔ سارے علاقے میں مشہور ہے کہ وہ بندھن کھول دیتی ہے۔

ہر سال بیساکھ کی پورن ماشی کے دن ارد گرد کے علاقے سے عورتیں دیوی کی آگے سیس نوانے کے لیے آتی ہیں۔ کوئی پتی کے من میں پڑی ہوئی گرہ کھولنے کے لیے پرارتھنا کرتی ہے۔ کوئی بیٹے کے دل میں پریم بندھن کے خلاف ہا ہا کار مچاتی ہے۔ کوئی ساس بہو کے کروڑھ کھولنے کی بنتی کرتی ہے۔ کوئی اولاد کی روک کاروٹا روتی ہے۔

پورن ماشی کی رات شام ہی سے دیوی کا بھجن شروع ہو جاتا ہے۔ جوں جوں رات بھگتی ہے، ممبے پر ایک کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ پھر آدھی رات کے قریب بارہ ماتری درت لے شروع ہوتی ہے۔

”دیوی۔۔۔۔۔ کھل بندھنا۔“

اس پر سارے یا تری اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان پر وجدان کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ دل پر وجدان طاری ہو جائے تو سارے اعضاء رقص کرنے لگتے ہیں۔ کوئی برملا، کوئی گپت۔ جب یہ رقص اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو مندر میں ایک عجیب سی آواز پیدا ہوتی ہے یوں جیسے آکاش سے گھنگھر و گرے ہوں۔

اس پر پجاری ساکت ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ ٹھک ٹھک گھنگھر و بندھے پاؤں قدم قدم قریب آتے ہیں اور دیوی کے پاس آ کر رک جاتے ہیں۔

عین اس وقت مندر کا مہانتری سکھ بجاتا ہے۔ سکھ کی آواز سن کر پھر سے کھل بندھنا کا بھجن شروع ہو جاتا ہے۔ سکھ روتا ہے۔ ڈھولک سرچٹتی ہے اور لوگ بھجن کے پردے میں آہ وزاری کرتے ہیں۔

عین اس وقت سیوا کارن جو گیا دھوتی میں ملبوس موتیے کے ہار لپیٹے دیوی کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ تیز، تیز۔۔۔۔۔ اور تیز۔ ساتھ ہی چھت سے لٹکا ہوا چاندی کا رسہ جھومنے لگتا ہے۔ اس جھولن جھومن میں رسے کے بل کھلنے لگتے ہیں۔ کھلتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ چاندی کی تاریں یوں ایک ایک ہو کر لٹکنے لگتی ہیں جیسے کسی ٹیاری نے سکھانے کے لیے بال کھول رکھے ہوں۔

یہی دیوی کا معجزہ ہے۔ اسی لیے دیوی کا نام کھل بندھنا مشہور ہے۔

ساری چاتریاں ایک ایک کر کے مندر سے جا چکی تھیں۔ صرف کانتا، کنول اور سیٹے عورت کے بندھنوں کی شکایت کی زنجیر میں

”اس کی آواز کو کیا ہے؟“ کنول نے زیر لب پوچھا۔ ”عورت کی سی نہیں۔“

”رورو کے میرا گلارندھ گیا ہے۔“ کالی چادر والی نے کہا۔

”تو مہمان کو جانتی ہے کیا؟“ کانتے نے پوچھا۔

”جانتی ہوں۔ میں اس کی بالکی ہوں۔“ کالی چادر والی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لیکن وہ کوٹھڑی کی طرف پیٹھ کئے ہوئے تھی۔

”مہمان کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے کیا؟“

”مہمان کون تھی؟“

”اس پر کیا بتی؟“

کوئی کچھ نہ کچھ کہہ رہی تھی۔

پھر کوٹھڑی میں خاموشی چھا گئی۔

دفعۃً کالی چادر والی بولی۔ ”مہمان کے مات پتا نذر کوٹ کی ریاست میں رہتے تھے۔ گھر کھانے کو سوکھی روٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔

جب مہمان ان کے گھر پیدا ہوئی تو ماں باپ کے دل میں امید کا دیا ٹٹمیا کہ پتری بڑی ہوگی تو ریاست کے مہاراجہ کی بھینٹ کریں

گے۔ چھوٹی موٹی جاگیر مل جائے گی۔ جیون سکھی ہو جائے گا۔“

”مہاراجہ کی بھینٹ۔۔۔۔۔؟“ کنول نے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں مہاراجہ کی بھینٹ۔ ان دنوں یہ رواج تھا۔ ماں باپ سندر پتریاں مہاراجہ کی بھینٹ کر دیتے تھے۔ مہاراج چار ایک روج کلی کا

رس چوستے۔ پھر اسے پرانے محل میں پھینک دیتے جہاں مہاراج کے نوکر چاکر پھول کی پنکھڑیاں نوچتے اور پھر جب وہ ڈنٹھل بن

جاتی تو کال کوٹھڑی میں دھکیل دیتے۔ یہی ان دنوں کی ریت تھی۔“

”پتری سندر تھی۔ مات پتا نے اس کا نام شو بھارکھ دیا۔“ کالی چادر والی نے آہ بھر کر کہا۔

”شو بھاکون؟“ سینے گنگنائی۔

”وہی۔۔۔۔۔“ کالی چادر والی نے آہ بھر کر کہا۔ ”جو مندر میں آ کر پسیا کرتے کرتے مہمان بن گئی۔“ وہ تینوں چپ چاپ بت

بنے بیٹھی تھیں۔

”مات پتا نے شو بھا کے پیٹ اور گالوں پر حلوہ باندھ باندھ کر پتری کو بڑا کیا کہ پیٹ ملائم رہے گال چکنے ہو جائیں۔ سینے پر سمندر

جھاگ ملی کہ اہل کرا بھرے۔ منہ پر دودھ کے چھینٹے دیئے کہ رس بھر جائے۔ رانوں پر گھی کی مالشیں کیں کہ چمک بڑھے۔ کمر پر کمر بند کس دیا کہ ربٹ کے گیند کی طرحیوں ابھرا بھر کر جھٹکے۔“

”توبہ ہے۔“ بیٹے نے آہ بھری۔

”جب شو بھا بڑی ہوئی تو اس میں وہ سب کچھ تھا جو مات پتانے چاہا تھا۔ جسم تیار تھا پر من میں اڑن تھی۔“

”اڑن کیوں؟“ کنول نے پوچھا۔

”جب شو بھا کو پتہ چلا کہ اسے بھینٹ چڑھا دیا جا رہا ہے تو اس کے من نے کہا۔ میں سب کچھ بنوں گی پر بھینٹ نہ چڑھوں گی۔ مجھے تھالی میں پروں کر دو جے کے سامنے نہ دھرا جائے۔ میں کنیا ہوں، کھا جائیں ہوں۔

جب وہ اسے راجہ کے محل میں لے کر گئے تو حواریوں نے اسے اچھی طرح دیکھا کہ راجہ کے لائق ہے بھی یا نہیں۔ پھر وہ اسے مہاراج کی بیج پر بٹھا کر چلے گئے کہ مہاراج ابھی آتے ہیں۔

وہ وہاں سے اٹھ بھاگی۔ کھڑکی سے باہر نکلی۔ پر نصیب کا لکھا کون مٹا سکے ہے۔ باہر کے کواڑ کی بجائے بھیت کے کواڑ میں سے ہو کر پرانے محل میں جا پہنچی جہاں مہاراج کے نوکر تاک میں بیٹھے تھے۔ پتہ نہیں بھیڑیئے اسے بھنبھوڑتے رہے۔ پر ایک دن وہ وہاں سے بھی نکل بھاگی۔

پریم کا گریا جگہ جگہ سے تڑخ چکی تھی۔ اب اس میں دودھ بھرنے کی بات نہ رہی تھی۔ اس لیے وہ سیدھی شار جانا نیکہ کے پاس پہنچی۔ بولی لے نا نیکہ مجھے بچ اور کھا۔ اپنی جھولی بھر۔ اب میں کسی اور کام کی نہیں رہی۔“ کالی چادر والی خاموش ہو گئی۔

دیر تک کوٹھڑی میں گرم صم رہی جیسے اوپر چپ کا تنبوتا ہو۔ صرف دل دھک دھک کر رہے تھے۔ گردنیں باہر نکل گئی ہوئی تھیں۔ سینوں کی نوکیں ابھر کا کانٹے بن گئی تھیں۔

پھر کالی چادر والی نے ایک لمبی آہ بھری۔ بولی ”پھر شو بھا کا وہ چر چا ہوا، وہ چر چا ہوا کہ مہاراج کے درباری بھی اس کے دوار پر کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اک دن مہاراج خود چو بارے پر آ پہنچے۔

شو بھا کے پاس کیا نہ تھا۔ پوشاکیں، جیور، ہیرے جو اہرات اور دھن۔ دھن ہی دھن۔ اوپر سے وہ پھول سان کھلی کھلی تھی پر بھیت میں ایک کانٹا لگا تھا۔ سو جتنی کتنی اپرا دھن ہوں میں کہ جگہ جگہ بوٹیاں تڑوائیں۔ بکی پر مات پتا کو جا گیر نہ لینے دی۔ ان کا سودا کھونا کر دیا۔ پتہ نہیں اب کس حال میں ہیں۔ اس کانٹے نے اس کے بھیت کو لولہاں کر دیا۔ خود کو اپرا دھن جاننے لگی تو پھر رہا نہ گیا۔ گہنے پاتے کی گٹھڑی باندھی اور چوری چوری چو بارے سے نکل گئی۔

مات پتا کو اپنی قیمت چکانے کے لیے گاؤں پہنچی تو پتہ چلا کہ وہ بھوک کے مارے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے۔ “کالی چادر والی پھر رک گئی۔

تینوں چھوکریاں یوں بیٹھی تھیں جیسے مایا اتر گئی ہو۔ استری ٹوٹ گئی ہو۔ جیسے پا پر سے کڑا کا نکل گیا ہو۔

”شو بھا کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔“ کالی چادر والی یوں بولی جیسے آواز بھینگ گئی ہو۔ ”دوسریں اور گر گئی ہو۔“ کالی چادر والی پھر رک گئی۔

”پھر۔۔۔۔۔؟“ سیتے گھکیائی۔

”پھر۔۔۔۔۔“ کالی چادر والی نے دہرایا۔ ”پھر شو بھا کی نظر میں جیسے سب کچھ کچھ بھی نہیں ہو گیا۔ دھن دولت بانٹ دی اور کھل بندھنا کے دوار پر آ بیٹھی۔ دیوی باہر کے بندھن تو ٹوٹ گئے۔ بھیت کے بھی کھول دے۔“ کالی چادر والی آہ بھر کر بولی۔

”بھیت کے دو بندھن اسے جکڑے ہوئے تھے۔ اک یہ کہ اس نے مات پت کا اپمان کیا تھا۔“

”اور دو جا۔۔۔۔۔؟“ کانتا کے ہونٹ ہلے پر کالی چادر والی چپ رہی۔

”پھر۔۔۔۔۔؟“ کنول کی آواز سنائی دی۔ پروہت بنی بیٹھی رہی۔ بیٹھی رہی۔

پھر دور کوئی بالک رویا تو کالی چادر والی چوکی۔ بولی ”سنو سنو دو جا بندھن آپ ہی بول پڑا۔ اس کے من میں ایک بالک روتا تھا۔
ممتا سر جیتی تھی۔ چھاتیاں سراٹھا کر بین کرتی تھیں۔ وہ تھیلی تڑپتی تھی جہاں بالک آنا چاہے تھا۔ من لہو کے آنسو روتا تھا۔ جوں جوں
بالک روتا، توں توں شو بھا دیوی کے چرنوں میں تڑپ تڑپ کر بنتی کرتی۔ آدھی آدھی رات کے سہ دیوی کے بھجن گاتا۔
دیوی۔۔۔۔۔ کھل بندھنا۔

اس نے اتنی پتیا کی، اتنی پتیا کی کہ مہمان بن گئی۔

پھر ایک رات وہ دیوی کے چہنوں میں سیس نوانے بیٹھی تھی تو مندر میں اک ہلکی آواز ابھری۔ ”چپ“ اس نے سراٹھا کر دیکھا تو دیوی نے اپنی انگلی ہونٹوں پر رکھی ہوئی تھی اور سارا مندر ”چپ“ گنگنا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے الٹا اپنی مانگ کو دہرا کر شروع کر دیا۔ پھر ایک کروڑھ بھری آواز ابھری۔ اندھی مغلّتی اپنی مانگ کو جان۔ اس پر بھی وہ نہ سمجھی۔ تو دیوی بولی ”استری بندھن ہی بندھن ہوتی ہے۔ جو بھتیر کے بندھن بھی کھل گئے تو استری استری نہ رہے گی۔“ یہ سن کر وہ ڈر گئی پر سمجھی پھر بھی نہیں۔

دیوی بولی ”استری لیروں کے کھدو سمان ہوتی ہے۔ لیروں نکال دو تو کھدو کہاں رہے گا؟“

وہ پھر بھی نہ سمجھی، الٹی پھر سے بھجن رہے تھے لگی۔۔۔۔۔ ”دیوی کھل بندھنا“ ناچ ناچ کر دیوی کو منانے لگی۔

پھر دیوی جیسے کرودھ میں بولی ”جاتیرے بھتیر کے بندھن کھل گئے۔“

اس پر مندر ڈولنے لگا جیسے بھونچال آگیا ہوا اور مہمان گر پڑی۔“

کالی چادر والی نے چادر لپیٹی اور اٹھ بیٹھی اور قدم قدم ان کی طرف چل پڑی۔ جب وہ محراب کے نیچے پہنچی تو سیتے ہوئی ”پھر کیا

”

وہ رک گئی۔ ”پھر کیا ہوا۔۔۔۔۔!“

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ پھر کیا ہوا؟“

”پھر۔۔۔۔۔“ کالی چادر والی نے اپنے منہ سے چادر اٹھادی۔۔۔۔۔ ”پھر یہ ہوا۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔“

انہوں نے سراٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ دہشت سے ان کی چیخیں نکل گئیں۔ ان کے سامنے پتہ نہیں کون سی مخلوق کھڑی تھی۔ نہ

وہ عورت نہ مرد۔ تینوں لڑکیوں نے خوفزدہ ہو کر منہ چھپا لیے۔

بھاگی نے سیوا کارن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ”سن رہی ہو سیوا کارن‘ سن رہی ہو؟ وہ دیوی کے چرنوں میں بھیجن بیٹھ کر رہی ہے۔“

سیواکارن بھاگی بھاگی باہر نکلی۔ دونوں مندر کے بڑے دروازے کی طرف دوڑیں۔ مہابان کی کوشٹھری کی کنڈی کھل گئی۔ ”مجھے

پتہ تھا کہ اک دن ابھانگی کا چکر لٹوٹ جائے گا۔ سیوا کارن سن تو سہی۔ ”بھاگی چلائی۔“

وہ سب سننے لگیں۔

”کھل بندھنا۔۔۔۔۔۔ بندھوے۔“

”سنا تو نے۔“ بھاگی چیخی۔ ”مہمانن نے بول بدل دیے۔“

”ہاں۔۔۔۔!“ سیواکارن بولی۔ ”مہاجوگی کہتے تھے ایک دن آئے گا جد چاندی کا رسہ نہیں کھلے گا۔“

”اے دیوی تیری جے ہو۔“

سیواکارن نے ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لے۔ اندر کوئی گائے جا رہی تھی۔

”کھل بندھنا۔۔۔۔۔ بندھ دے۔ کھل بندھنا۔۔۔۔۔“



روغنی پتلے

شہر کا ایٹ شاپنگ سنٹر۔۔۔۔۔ جس کی دیواریں 'شلف' الماریاں بلور کی بنی ہوئی ہیں۔ جس کا بنا سجا فیکڈ جلتے بجھتے رنگ دار سائز سے مزین ہے۔ جس کے کاؤنٹرز سامان سے لدے ہیں جس کے کاؤنٹروں پر سمارٹ متبسم لڑکیاں اور لڑکے یوں استادہ ہیں جیسے وہ بھی پلاسٹک کے پتلے ہوں۔ جوان کی ارد گرد یہاں وہاں سارے ہال میں جگہ جگہ رنگ رنگ لباس پہنے کھڑے ہیں۔ ہاں فیشن آرکیڈ سے کون واقف نہیں۔

چاہے انہیں کچھ نہ خریدنا ہو، لوگ کسی نہ کسی بہانے فیشن آرکیڈ کا پھیرا ضرور لگاتے ہیں۔ وہاں گھومتے پھرتے نظر آنا ایک حیثیت پیدا کر دیتا ہے۔ کچھ پاش چیزوں اور نئے ڈیزائنوں کو دیکھنے آتے ہیں تاکہ محفلوں میں Latest فیشن کی بات کر کے اپنا ڈیٹا ہونے کا رعب جما سکیں۔ نو جوان آرکیڈ میں گھومنے پھرنے والیوں کو نگاہوں سے ٹٹولنے آتے ہیں۔ غنڈے سیل گریز سے اناٹا لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لڑکیاں اپنی نمائش کے لیے آتی ہیں۔ بوڑھے خالی آنکھیں سینکتے ہیں۔ گھاگ بیگمات گرین یوتھ کی ٹوہ میں آتی ہیں۔ وہ صرف فیشن آرکیڈ ہی نہیں، رومان آرکیڈ بھی ہے کیوں نہ ہو۔ آج محبت بھی تو فیشن ہی ہے۔

کون سی چیز ہے جو فیشن آرکیڈ مہیا نہیں کرتا۔ زربفت سے گاڑھے تک۔ موسٹ ماڈرن کپشس سے سوئی سلائی تک سی تھرو سے رنگین مالاؤں تک۔ سب کچھ وہاں موجود ہے۔ لوگ گھوم گھام کر تھک جاتے ہیں تو آرکیڈ کے ریسٹوران میں کافی کا پیالہ لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔

فیشن آرکیڈ کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ فارن ڈکنٹریز نے خرید و فروخت کرنی ہو تو انہیں خاص انتظام کے تحت آرکیڈ میں لایا جاتا ہے۔

آرکیڈ ہال میں جگہ جگہ روغنی پتلے طرح طرح کے لباس پہنے کھڑے ہیں۔ چہروں پر جوانی کی سرفی جھللا رہی ہے۔ آنکھوں میں دعوت بھری چمک ہے۔ ہونٹوں پر رضامندی بھرا قسم کھدا ہے۔ جسم کے پیچ و خم ہر لحظہ یوں ابھرتے سمٹتے محسوس ہوتے ہیں جیسے سپردگی کے لیے بے تاب ہوں۔

اگرچہ ڈمی پتلے پلاسٹک کے جمود میں مقید ہیں مگر صناعت نے انہیں ایسی کاریگری سے بنایا ہے کہ ان کے بند بند میں حرکت کی

ایوژن لہریں لے رہی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ رواں دواں ہوں۔

سرتھر ولباس والی پتلی کو دیکھو تو ایسے لگتا ہے جیسے وہ ابھی اپنی برہنہ ٹانگ اٹھا کر کہے گی ”ہے مجھے سنبھالو! میں گری جا رہی ہوں۔“ اور جیکٹ والا اپنی عینک اتار کر مونچھوں کو لٹکاتے ہوئے چل پڑے گا۔ ”ہولڈ آن ڈارلنگ! میری گود میں گرنا۔“ آرکیڈ میں بہت سی پتلیاں پوز بنائے کھڑی ہیں۔ منی سکرٹ والی، سکرٹ والی، ساڑھی والی، بیدنگ کا سٹیوم والی، میکسی والی، سی تھر ولباس والی، لٹکتے بالوں والی، پتلون والی، ننگے پاؤں والی، مین، ٹوکر بالوں والی، انگلی سے لگے بچے والی۔ ان کے ساتھ ساتھ پتلے کھڑے ہیں۔ شکاری جیکٹ والا، دانشور، موٹر سائیکل والا، بلیک سوٹ، اچکن، پی کرتے پاجامے والا، سٹوڈنٹ، ڈینڈی، مصور۔

آرکیڈ ہال کے اوپر دیوار کے ساتھ ساتھ ایک گیلری چلی گئی ہے۔ جہاں نظروں سے اوجھل دکان کا کاٹھ کباڑ پڑا ہے۔ پرانی میزیں کرسیاں، شلف اور پتلے جن کا رنگ وروغن اکھڑ چکا ہے۔ رات کا وقت ہے۔ آرکیڈ بند ہو چکا ہے۔ ہال میں سات آٹھ بتیاں روشن ہیں۔ شیشے کی دیواروں کی وجہ سے ہال جگمگ کر رہا ہے۔ گھڑی نے دو بجائے۔ سارے ہال میں حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ پتلیوں نے آنکھیں کھول دیں۔ پتلیوں کی لمبی لمبی پلکیں یوں چلنے لگیں جیسے پنکھیاں چل رہی ہوں۔

سی تھر وٹنے انگڑائی لی۔

منی سکرٹ والی نے اپنی ٹانگ اٹھائی۔

جیکٹ والے دانشور نے اپنا قلم جیب میں ٹانگا۔ عینک صاف کی اور سی تھر کی طرف بھوکی نظروں سے دیکھنے لگا۔

موٹر سائیکل والے نے پیچھے بیٹھی لٹکتے بالوں والی پر گلیڈ آئی چمکائی۔ لٹکتے بالوں والی سے چھینٹے اڑنے لگے۔

”مائی گاڈ“ سی تھر وچلائی۔ ”یہ دیکھو! اس نے اپنی ٹانگ لہرائی۔ میری ٹانگ پر نیلی رگیں ابھر آئی ہیں کھڑے کھڑے۔“

”کیوں نہ ہو! بلیو بلڈ ہے۔“ بلیک سوٹ مسکرایا۔

دور سے آواز آئی۔ ”ساغر کمرے ہاتھ سے لینا کہ چلی میں“ سب لوگ کس کے پاس کھڑی پتلون والی کی طرف دیکھنے لگے۔

”تیرے ہاتھ خالی ہیں۔ کہاں ہے ساغر؟“ کرتے پاجامے والے نے پوچھا۔

”اندھے وہ تو خود ساغر ہے۔ دکھتا نہیں تھے۔“ جین والا ہنسا۔

”میں تو بور ہو گئی ہوں۔“ منی سکرٹ والی نے آنکھیں گھما کر کہا۔

”کیوں مذاق کرتی ہو؟“ موٹر سائیکل والے نے گلہ آئی چمکائی۔

”تم تو سراپا حرکت ہو۔ تمہاری تو بوٹی بوٹی تھرکتی ہے۔ تم کیسے بور ہو سکتی ہو؟“

”کیوں بناتے ہو اسے اس کے جسم پر بوٹی ہی نہیں تھرکے گی کہاں سے۔“ دور کھڑے کونے میں کھڑے اچکن والے نے کہا۔

”ہاں“ پہلوان نما کرتے والے نے سر اثبات میں ہلایا۔ وہ تو میاں کا زمانہ تھا جب بوٹی بوٹی تھرکا کرتی تھی۔ اب تو کاٹھ ہی کاٹھ

رہ گیا ہے۔“

”شٹ اپ“ جین والے نے آنکھیں دکھائیں۔ ”اپنے دقیانوسی رجعت پسند خیالات سے فیشن آرکیڈ کی فضا کو متعفن نہ کرو۔“

”ابے مسٹر اچکن“ سٹوڈنٹ چلایا۔ ”ذرا آئینہ دیکھو یوں لگتے ہو جیسے سارنگی پر غلاف چڑھا ہے۔“

”یہ مسٹر اچکن تو خالص ہسٹری ہے ہسٹری۔ اسے تو میوزیم میں ہونا چاہیے۔“

”انٹیکس میوزیم میں۔“ جیکٹ والے نے قہقہہ لگایا۔

”بالکل ان روایتی لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں۔“

”یہ لوگ زندگی کو کیا جانیں۔“

”ہپو کریٹس“ ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

”اگنور ہم ہٹاؤ۔۔۔ کوئی اور بات کرو۔“ سی تھر و آنکھیں گھما کر بولی۔

”ہاؤ کین وی اگنور ہم؟ یہ لوگ ہمارے راستے کی رکاوٹ ہیں۔“

”نان سنس ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ وی آر آل فار پروگرس موومنٹ۔“ جیکٹ والا چلا کر بولا۔

”ہیر ہیر“ تالیوں سے ہال گونجنے لگا۔

”بابا بابا“ اوپر گیلری میں کوئی قہقہہ مار کر ہنسا۔ اس کی آواز کھرج تھی۔ انداز والہانہ تھا۔ تالیاں رک گئیں۔ ہال میں خاموشی چھا

گئی۔ پھر سرگوشیاں ابھریں۔

”کون ہے یہ؟“

”کون ہنس رہا ہے؟“

”پتا نہیں، اوپر سے آواز آرہی ہے۔“

”ہے میں تو ڈر گئی، کتنی ہورس آواز ہے۔“

قہقہہ رک گیا۔ پھر قدموں کی آواز سنائی دی۔۔۔۔۔ ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک

”کوئی چل رہا ہے اوپر“

”ہے میری تو جان ہی نکلی جا رہی ہے۔“

”پتا نہیں کون ہے۔“ منی اسکرٹ والی بولی۔

”ڈونٹ فیز ڈارلنگ، آئی ایم ہیر بائی یور سائیڈ“

”وہ دیکھو۔۔۔۔۔ وہ“ نوکرا بالوں والی نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

”اوپر۔۔۔۔۔ گیلری کے چنگلے پر۔“ ساڑھی والی ڈر کر بولی۔

سب کی نگاہیں اوپر چنگلے کی طرف اٹھ گئیں۔

گیلری کی رینگ سے ایک بڑا بھیا تک چہرہ جھانک رہا تھا۔

”توبہ ہے، اف۔۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔۔“ پتلیوں نے شور مچا دیا۔

”کون ہے تو؟“ موٹر سائیکل والا اپنا سائلنسر نکال کر غرایا۔

”میں وہ ہوں جو ایک روز مشہدی لنگی باندھے وہاں کھڑا تھا۔ جہاں آج تو کھڑا ہے۔“

”اس کی آواز اتنی بھدی کیوں ہے؟“ سی تھرو نے سینہ سنبھالا۔

”کہاں سے بول رہا ہے یہ؟“ پتلون والی نے پوچھا۔

”میں وہاں سے بول رہا ہوں جہاں بہت جلد تم پھینکی جانے والی ہو۔“ لنگی والا کہنے لگا۔

پتلیوں کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ان کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ ”نوو۔۔۔۔۔ نوو، نیور مائی گاڈ۔ ہے اللہ۔ وہ سب ہم کر پیچھے ہٹ

گئیں۔

”ڈونٹ ماسٹڈ ہم ڈارلنگ۔“ جین والا بولا ”یہ تو پتا ہوا مہرہ ہے۔ پٹے ہوئے مہرے سے کیا ڈرنا۔“

”دیش اس دیش اس دے بلانگ ٹو دی پاسٹ“

”یہ اب بھی ماضی میں رہتے ہیں اور ہم کو ماضی کی طرف گھسیٹنا چاہتے ہیں۔“ جیکٹ والا تحارت سے بولا

”بڑے میاں سلام۔“ جیکٹ والے نے ماتھے پر ہاتھ مار کر طنزیہ سلام کیا۔ ”ماضی پرستی کا دور ختم ہوا۔ نصرت اب جدیدیت کا زمانہ ہے۔“

گیلری میں اوندھا پڑا ہوا رومی ٹوپی والا انکڑا سوئی پکڑ کر اٹھ بیٹھا۔

”احق ہیں یہ جدیدیت کے دیوانے۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اس دنیا میں نہ قدیم ہے نہ جدید۔ جو آج جدید ہے وہ کل قدیم ہو جائے گا۔“

”یہ ظاہر کے دیوانے کیا سمجھیں گے۔“ مشہدی لنگی والے نے قہقہہ لگایا۔ ”کہ دور ایک گھومتا ہوا چکر ہے جو آج اوپر ہے کل نیچے چلا جائے گا۔ جو آج نیچے ہے کل اوپر آ جائے گا۔“

جین والے نے اپنی پتلون جھاڑی ”ان کباڑ خانوں والوں کی باتیں تو سنو۔ یہ بے چارے کیا جانیں جدیدیت کو۔“

”جدیدیت کے دیوانے۔ آج تیری پتلون کے پانچ کچے کھلے ہیں۔ کل تنگ ہو جائیں گے۔ پرسوں پھر کھل جائیں گے۔ یہی ہے نا تیری جدیدیت۔“ رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔

”ذرا اس کی جین کی طرف دیکھو۔“ لنگی والا بولا ”نیلی پتلون پر سرخ ٹلی لگی ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔ ہا ہا ہا۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

”احق یہ ٹلی نہیں۔ سچ ہے سچ۔ سچ فیشن ہے۔ سچ لگی جین کی قیمت عام پتلون سے دگنی ہوتی ہے۔ تجھے کچھ پتا بھی ہو۔“

”پیوند کبھی غربت کا نشان تھا۔ پیوند لگے کپڑوں والے سے لوگ یوں گھن کھاتے تھے جیسے کوڑی ہو۔ آج تم اس پیوند کی نمائش پر فخر محسوس کر رہے ہو۔“ مشہدی لنگی والا ہنسنے لگا۔ ”تم عجیب تماشا ہو۔“

رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔ ”دور جدید کے تحفیل کا فقدان ملاحظہ ہو۔ پیوند کو فیشن بنا بیٹھے ہیں۔ ہی ہی ہی ہی۔۔۔۔۔۔“

”سارا کریڈٹ ہمیں جاتا ہے۔“ پن نے سراٹھا کر کہا۔

”ہائیں۔۔۔۔۔۔ یہ کیا کہہ رہی ہے؟“ پتلون والی نے پوچھا۔

”لو“ سی تھرو زیر لب گنگنائی۔ ”چھلنی بھی بولی۔“

”ہاں“ پنی نے سینے پر ہاتھ مارا۔ ”سارا کریڈٹ ہمیں جاتا ہے۔“

”تعفن کا کریڈٹ غلاظت کا کریڈٹ اور کون سا۔“ بیدنگ کا سیٹوم والی بولی۔

”ساڑھی والی نے ناک چڑھائی۔

ہی نے قہقہہ لگایا۔ ”جدیدیت کے ذہنی تعفن کو دور کرنے کا کریڈٹ۔ جدیدیت کے بت توڑنے کا کریڈٹ۔ جھوٹی قدروں کو پاؤں تلے روندنے کے لیے ہمیں غلامت کو اپنانا پڑا۔“
 سپورٹس گرل نے بیڈمنٹن ریکٹ کو گھما کر دانت نکالے۔

”ڈینیئل کریم کا اشتہار کسے دکھا رہی ہو؟“ ہی ہنسا۔ ”ہم نے دور حاضرہ کے سب سے بڑے بت دولت کو پاش پاش کر دیا۔ ہم نے جھوٹے رکھ رکھاؤ کا بت ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ ہم نے ماڈرن ایج کے واحد دل بہلاوے سال کنفرٹس کی نفی کر دی۔ ہم نے مغربی تہذیب کا جنازہ نکال دیا۔“

”یہ بے چارے کیا جانیں۔“ پن بولی ”ظاہریت کے متوالے۔۔۔۔۔۔ جب کوئی تہذیب متعفن ہو جاتی ہے تو اسے مسمار کرنے کے لیے مجاہد بھیج دیئے جاتے ہیں۔ ہم وہ مجاہد ہیں۔“

”تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔“ رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔

”بالکل درست“ لنگی والا چلایا۔ ”یہ بڑا ٹرانزیشنل دور ہے۔ جب ایک شو ختم ہو جاتا ہے تو دوسرے شو کے واسطے ہال صاف کرنے کے لیے جمعہ آ جاتے ہیں۔ یہ جمعہ اروں کا دور ہے۔“

”سلی فول۔“ سی تھرڈ ہنسی۔ ”یہ تو رومانس کا دور ہے۔“

”رومانس“ گیلری کے کاٹھ کباڑ سے ایک مجنوں صفت دیوانہ لپک کر رینگ پر آ کھڑا ہوا۔ ”تم کیا جانو رومان کیا ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ تمہارے دور نے تو عشق کا گلا گھونٹ دیا۔ عاشق کو ٹھنڈا کر کے رکھ دیا۔ محبوب سے محبوبیت چھین کر اسے رنڈی بنا دیا۔

عریانی کو رومان نہیں کہتے بی بی“

”ہالڈر ڈیش“

”نان سینس“

رومی ٹوپی والے نے ایک لمبی آہ بھری۔ ”دوستو ہمارے زمانے میں عورت کا نقاب سرک جاتا تھا تو گال دیکھ کر مرد میں تحریک پیدا ہوتی تھی لیکن اب ننگے پنڈوں کی یلغار نے مردانہ حس کو کند کر دیا ہے۔ تمہارے دور نے مرد کو نامرد اور عورت کو بانجھ کر کے رکھ دیا ہے۔“

جیکٹ والا آگے بڑھا۔ اس نے قلم جیب میں ڈالا۔ عینک اتاری۔ ”ہم جنس کے متوالے نہیں۔ ہم جنس کی دلیل میں ڈوبے ہوئے نہیں ہیں۔ دور حاضر میں سب سے اہم ترین مسئلہ اقتصادیات کا ہے۔ تم حالات حاضرہ سے چشم پوشی کرتے ہو۔ ہم تمہاری طرح حالات حاضرہ سے آنکھیں نہیں چراتے۔ ہم ترقی پسند لوگ ہیں۔“

”حالات حاضرہ“ رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔ ”تمہارے نزدیک حالات حاضرہ روٹی، کپڑا اور مکان میں ہیں۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ انا کا ہے۔ سلف کا۔۔۔۔۔ میں کا۔“

”روٹی کپڑے والو ہماری طرف دیکھو، پین چلائی“ جو ملتا ہے کھا لیتے ہی۔ جہاں بیٹھ جاتے ہیں وہی ٹھکانہ بن جاتا ہے۔ جو میسر آتا ہے پین لیتے ہیں۔ کہاں ہیں وہ مسئلے جنہیں تم اہرام مصر بنائے بیٹھے ہو۔“

”اونہوں انہیں کچھ نہ کہو۔ یہ تو فارن خیالات کی ایڈ کے بل بوتے پر کھڑے ہیں۔ انہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکا۔“ رومی ٹوپی والا بولا۔

”کل جب روٹی، کپڑا اور مکان کا مسئلہ حل ہو جائے گا پھر تمہارے ہاتھ پلے کیا رہ جائے گا بتاؤ۔“ پین بولی۔

”یہ تو حرکت کے متوالے ہیں منزل کے نہیں۔ انہیں صرف چلنے کا شوق ہے پہنچنے کا نہیں۔“ مشہدی لنگی والے نے منہ بنایا۔

”بکو نہیں ہمارے راستے میں جو شخص روڑے اٹکائے گا اس پر رجعت پسندی کا لیبل لگا دیا جائے گا۔“

پہی قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”سو واٹ۔۔۔۔۔ ہم پیوں پر رجعت پسندی کا لیبل لگاؤ۔ بے شک لگاؤ۔ ہم نے کیپٹل ازم کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ ہم نے اقتداری پسندی کا تمسخر اڑایا ہے۔ ہم میں اور ان گوریلوں میں کیا فرق ہے جو سرمایہ داری کے خلاف جان کی بازی لگائے بیٹھے ہیں۔“

”صرف یہی کہ طریق کار مختلف ہے۔“ پین نے لقمہ دیا۔

ہال پر سناٹا چھا گیا۔

سی تھر واپنے جسم کے پیچ و خم کا جائزہ لے رہی تھی۔ ساڑھی والی اپنا پلو سنہال رہی تھی۔ لٹکے بالوں والی منہ میں انگلی ڈالے کھڑی تھی۔ پتلون والی کا چہرہ حقارت سے چمندر بنا ہوا تھا۔ جیکٹ والا سر کھجاتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔ ”کتابوں میں تو یہ بات کہیں نظری نہیں گزری۔“

مجنوں نما نے قہقہہ لگایا ”خود کو زندگی کے متوالے گردانے والے کتابوں کی بیساکھیوں کے سہارے کے بغیر چل نہیں سکتے۔“

زندگی کتابوں سے اخذ نہیں کی جاتی، مسٹر۔ زندگی حال ہے۔۔۔۔۔ کسی صاحب حال سے پوچھو۔“

”جو قیل و قال کے دیوانے ہیں، انہیں حال کا کیا پتہ؟“ لنگلی والا بولا۔

”انہیں اتنا نہیں پتا کہ حال پر قیل و قال نہیں ہو سکتا۔ حال کو رو نہیں کیا جاسکتا۔ حال سب سے بڑی حقیقت ہے۔“

ہال پر خاموشی چھا گئی۔

پھر دور سے ایک سرگوشی ابھری۔۔۔۔۔ ”میں کہاں آ پھنسی ہوں۔“ بچے کو لنگلی لگائے کھڑی ماں گنگنا رہی تھی۔ ”یہ دور ماں کا

دور نہیں۔ یہ تو عورت کا دور ہے۔ میں کہاں آ پھنسی ہوں۔“

”عورت کا نہیں بی بی، پہلوان کرتے والے نے سر ہلا کر کہا۔“ یہ تو لڑکی کا دور ہے۔ انہیں کیا پتہ کہ عورت کسے کہتے ہیں۔ بال

سفید ہو جاتے ہیں، پھر بھی یہ لڑکیاں ہی بنی رہتی ہیں۔“

”خاموش“ آرکیڈ کی فرنٹ رو میں کھڑی ٹوکرا بالوں والی بولی۔ ”سنو سنو، یہ کیسی آواز ہے؟“

”کون سی آواز؟“

”کدھر ہے آواز؟“

”چپ“ موٹر سائیکل والا چلایا۔ ”یہ تو ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی ہے۔“

”یہ آواز تو باہر سے آرہی ہے۔“ منی سکرٹ والی نے کہا۔

جیکٹ والے نے عینک صاف کی اور باہر دیکھنے لگا۔

”ہے اللہ“ سی تھر و بولی ”یہ آواز تو ایمر جنسی فون بوتھ سے آرہی ہے۔ وہ جو باہر پورٹیکو میں ہے۔“

”خاموش“ شکاری ڈانٹ کر بولا ”سب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاؤ۔۔۔۔۔ وہ آرہا ہے۔“

”کون آرہا ہے؟“ سی تھر و نے زیر لب پوچھا۔

”چوکیدار“

”چوکیدار“ پتلیاں سہم کر پیچھے ہٹ گئیں۔ پتلے باہر جھانکنے لگے۔

سامنے ایک اونچا لمبا، جھلمی جوان خاکی وردی پہنے سر پر پگڑی لپیٹے ہاتھ میں سوٹا اٹھائے بوتھ کی طرف بھاگا آ رہا تھا۔

”بالکل اجڈ نظر آتا ہے۔“ پتلون والی نے حقارت سے ہونٹ نکالے۔

”گامی، کروڑ، ان کو تھ“، ٹو کر ابا لوں والی دانت بھیج کر بولی۔

”میرے بدن پر تو رو گئے کھڑے ہو جاتے ہیں اسے دیکھ کر۔“ سی تھرو نے کہا۔

چوکیدار نے سونٹا باہر کھڑا کیا اور خود جلدی سے بوتھ میں داخل ہو گیا۔ اس نے ٹیلیفون کا چونکا اٹھایا اور فون پر باتیں کرنے لگا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن بات سنائی نہیں دے رہی تھی۔ چند ایک منٹ کے بعد وہ بوتھ سے باہر نکلا اور حسب معمول ہال کا چکر لگانے کی بجائے ہال کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

”ضرور کوئی ایمر جنسی ہے۔“ شکاری نے چھائے ہوئے سکوت کو توڑا۔

گیلری میں رومی ٹوپی والا ہنسا۔ ”ایمر جنسی۔۔۔۔۔ یہ دور تو بذات خود ایک سٹیٹ آف ایمر جنسی ہے۔“

”ایک اباں ہے“ بے مقصد اباں۔“ لنگی والے نے قہقہہ لگایا۔

منی سکرٹ نے لمبی لمبی پٹلیں جھپکا کر اوپر دیکھا۔

”اگنور ہم مائی ڈیز“ موٹر سائیکل نے سائینس فرٹ کر کے کہا۔

”میں کہتا ہوں ضروریہ کسی کے انتظار میں کھڑا ہے۔ ضرور کوئی آنے والا ہے۔“ سٹوڈنٹ زیر لب بولا۔

”چو کیدار کو دیکھ کر میری روح خشک ہو جاتی ہے۔“ سی تھرو نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

لنگی والے نے مسکرا کر کہا ”بی بی کیا تیرے اندر روح بھی ہے۔ ہوتی تو تو سی تھرو نہ ہوتی۔“

”کتنی ڈراؤنی شکل ہے چوکیدار کی۔“ پتلون والی، نگلی والے کے سوال کو دبانے کے لیے بولی۔

رومی ٹوپی والا ہنسے لگا۔ ”کتنی عجیب بات ہے! اپنوں کو دیکھ کر ڈر کر سہم جاتی ہیں۔ بیگانوں کو دیکھ کر ایٹ ہوم محسوس کرتی ہیں۔“

”شٹ اپ۔“ پتلون والی ڈانٹ کر بولی۔۔۔۔۔ ”یو۔۔۔۔۔ ان کلچرڈ۔“

ان کو تھ۔۔۔۔۔ سیوج۔“

”ول سید“ بلک سوٹ نے کہا۔ ”ہیر ہیر۔۔۔۔۔۔ جٹلمین چیئرز“

سارا ال تالیوں کی آواز سے گونجنے لگا۔ ”ہمارے دور میں ان سویلا رڈ۔ ان ایجوکیٹڈ لوگوں کو لب ہلانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔“ جیکٹ والا منہ سے جھاگ نکالتے ہوئے بولا۔

”تمہارا دور“ مجنوں نما ہنسا۔ ”نقا لوں کا دور چر بہ دور۔ یہ مغربی تہذیب کی کاہنی ہے کاہنی۔ بیگانوں کی طرز زندگی کی نقل کرو۔ ان

کے خیال کو اپناؤ۔ اپنوں سے لگتوں سے نفرت کرو۔ یہی نا۔“

[illegible]

”میں کہتی ہوں“ پین نے اس کی بات کاٹی۔ ”اگر نقل ہی کرنی ہے تو کسی ایسی قوم کی کرو جس میں جان ہے۔ زندگی ہے۔ چربہ بننا ہے تو کسی ایسی تہذیب کا بنو جو ابھر رہی ہے۔ کیوں ڈوبتے سورج کو پوچھ رہے ہو۔“

جیکٹ والے نے اپنا قلم جیب میں اٹکایا۔ عینک کو سنبھالا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرے اور ہال کے درمیان آ کر بولا ”کون نہیں جانتا کہ کون سی قومیں ابھر رہی ہیں۔“

مشہدی لنگی قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”ذرا اس فیشن آرکیڈ پر نظر دوڑاؤ۔ کیا یہ رنگ ان قوموں کا ہے جن کا تم حوالہ دے رہے ہو؟“

”کیا یہ منی سکرٹ، یہ سی تھرو بی بی اس آئیڈیل کے مظہر ہیں جس کے تم دعوے دار ہو؟ کیا تمہارا دور جس پر تم اتنے نازاں ہو تمہارے مقاصد کی نشاندہی کرتا ہے؟“ رومی ٹوٹی والا جوش میں بولا۔

[illegible]

ہال پر خاموشی طاری ہو گئی۔ سب چپ ہو گئے۔ رومی ٹوپی ہنسنے لگا۔ کسی نے رومی ٹوپی کو جواب نہ دیا۔
 ”وہ دن کب آئے گا؟“ دور سے یوں آواز سنائی دی جیسے کوئی آہیں بھر رہا ہو۔
 ”کون سا دن بی بی؟“ کرتے پاجامے نے پوچھا۔

”جب مجھے مامتا کے جذبے پر شرمندگی نہ ہوگی۔“ بچے کو انگلی لگائے کھڑی ماں بولی۔ ”جب اس آرکیڈ میں سر اٹھا کر کھڑی ہو سکوں گی۔“

”سچ کہتی ہو بی بی۔ آج کے دور میں مائیں اپنے بچوں کو اپناتے ہوئے شرم محسوس کرتی ہیں۔“ رومی ٹوپنی نے کہا۔
 ”وہ ماں کہلوانا نہیں چاہتیں۔“ کرتے پا جامے والا بولا ”بچوں سے کہتی ہیں مجھے باجی بلاؤ۔“

”آج کی عورت، عورت بن کر جینا چاہتی ہے ماں بن کر نہیں۔“ لنگی والا بولا۔

”میں پوچھتا ہوں کیا عورت کو عورت بن کر جینے کا حق نہیں۔ تم نے اسے ماں بنا کر قربانی کا بکرا بنا دیا تھا۔ ہم نے اسے عورت کی حیثیت سے جینے کا حق دیا ہے۔“ بلیک سوٹ نے کہا۔

”تمہیں کچھ پتا بھی ہو۔“ رومی ٹوپی ہنس کر بولا ”وہ سب تہذیبیں تباہ کر دی گئیں جنہوں نے مامتا کو رد کر دیا تھا اور عورت کو عورت بن کر جینے کا حق دیا تھا۔ اس دنیا میں صرف وہی تہذیب پنپ سکتی ہے جو بچے کو زندگی کا مقصد مانے۔“

”پاگل ہیں یہ ماضی کے دیوانے۔“ جیکٹ والے نے عینک اتار کر صاف کی۔ ”اتنا نہیں جانتے کہ آج سب سے بڑا معاشی مطالبہ یہ ہے کہ بچوں کی پیدائش کو روکا جائے۔“

”بالکل بالکل“ بلیک سوٹ نے ہاں میں ہاں ملائی۔

”بچے کم خوشحال گھرانہ۔“ موٹر سائیکل گنگنا نے لگا۔

”سبحان اللہ“ مشہدی لنگی والا بولا ”سوشل ازم کے نام لیوا سرمایہ داروں کے حربے کا پرچار کر رہے ہیں۔“

”بھائی صاحب بچے تو غربت کی پیداوار ہیں۔ قدرت کا اصول ہے جس گھر میں پیسے کی ریل پیل ہوگی بچے پیدا کرنے کی قوت کم ہو جائے گی۔ اگر غریبوں کی یہ صلاحیت ختم کر دی گئی تو تخلیق کا عمل مدھم پڑ جائے۔ شاید ہو جائے۔“ رومی ٹوپی نے کہا۔

”مین پاور کی عظمت کو ماننے والے بچوں کی پیدائش کو معاشی رکاوٹ سمجھ رہے ہیں۔“ مجنوں نما قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

”پتلیاں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگیں۔“

”کیا کہہ رہا ہے یہ؟“

”گاڈ نوز۔۔۔۔۔۔!“

”ہے چلڈرن آراے نوے سنس“

”سیانوں نے کہا تھا“ کرتا پا جامہ کہنے لگا ”کہ۔۔۔۔۔۔“

”کون سیانے؟“ جیکٹ والے نے پوچھا۔

”ہمارے لگتے لوگ۔“ کرتا پا جامہ نے وضاحت کی کوشش کی۔

”تم اپنے لگتوں کی کیا بات کر رہے ہو۔“ لنگی والے نے اسے ٹوکا۔ ”انہیں سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ان کے لگتے تو مغرب میں

رہتے ہیں۔ یہ تو مغربی تہذیب کے دیوانے ہیں۔“

”وہ دن دور نہیں۔“ اچکن والے نے کہا۔ ”جب انہیں اپنے لگتوں کو اپنا نا پڑے گا۔“

”بھول جاؤ وہ دن۔“ جیکٹ والا جلال میں بولا ”وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔“

”ہم ترقی کی جانب قدم اٹھا رہے ہیں۔ ہم آگے بڑھنے کے قائل ہیں۔ ہم کبھی واپس ماضی کی طرف نہیں جائیں گے۔“

موٹر سائیکل نے لٹکے بالوں والی کی طرف دیکھا۔ ”کیوں ڈارلنگ!“

”فارگٹ دیٹ ڈے اٹ ول نیور کم۔“ لٹکے بالوں والی نے جھٹک کر کہا۔

گیلری کے کاٹھ کباڑ سے ایک پتلا اٹھ بیٹھا۔ اس نے ایک لمبا چنڈہ پن رکھا تھا۔ سر پر کلاہ تھا۔ ”کون نہیں مانتا اس دن کو۔ کیا

تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ دنیا کا نظام بدل رہا ہے۔“

”اچھا بدل رہا ہے کیا۔“ شکاری نے طنزاً کہا۔

سب پتلے چسنے لگے۔

”دنیا کے سارے مذہب سارے نجومی سارے سینرز آنے والے گولڈن ایج کو مانتے ہیں۔“ چغے والا چلایا۔

”عیسائی، مسلمان، یہودی، ہندو سبھی مانتے ہیں۔ اسٹرا لوجرز اس کی شہادت دیتے ہیں۔“ رومی ٹوپی والے نے کہا۔

”وہ گولڈن ایج۔“ چغے والے نے انگلی اٹھا کر کہا۔ ”جب ترقی کا رخ مادی سہولتوں سے ہٹ کر روحانی مقاصد کی طرف مڑ

جائے گا۔ جب ہماری توجہ باہر کے آدمی کی جگہ اندر کے آدمی پر مرکوز ہو جائے گی۔ جب امن ہوگا۔ اطمینان کا دور دورہ ہوگا۔“

موٹر سائیکل نے طنز بھرا قبہ مارا۔

جیکٹ والے نے چلا کر کہا ”ضیغ الاعتقاد نہیں خوش فہمی ہے یہ۔“

”اچھا“ ماں بولی ”کیسا گولڈن ایج ہوگا وہ؟“

”نشاۃ ثانیہ“ ہال کی دیواریں گونجنے لگیں۔

”دنیا پر مبارک ترین ستاروں کا اکٹھ ہو رہا ہے۔ ایسا اکٹھ جو کبھی آج تک نہیں ہوا تھا۔“

چغے والا بولا ”اس کے اثرات ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ ظہور میں آئیں گے۔“

نوکر بالوں والی نے منہ میں انگلی ڈال لی۔ ”سچ؟“

ساڑھی والی نے سینہ سنہجایا۔

خاموش لٹکے بالوں والی چلائی۔ ”وہ دیکھو۔۔۔۔۔ وہ“ اس نے انگلی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ سب انگلی کی سیدھ میں پورٹیکو کی طرف دیکھنے لگے۔

”کیا ہوا؟“ دور سے پولکا بکس کے قریب کھڑی پتلون والی نے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“

”پتہ نہیں۔“

”کون ہے؟“

دور کھڑی پتلیاں سرگوشیاں کرنے لگیں۔

موٹر سائیکل نے اپنا سائلینٹ کر کے کہا۔ ”وہ آ رہے ہیں خاموش۔“ اس نے دور کھڑے پتلوں کو خبردار کیا۔ ”وہ آ رہے ہیں“ ادھر آ رہے ہیں۔“

”ہاں ہاں“ لٹکے بالوں والی نے کہا۔ ”انتقامہ کے لوگ آ رہے ہیں۔“

”بالکل“ ساڑھی والی نے کہا۔ ”وہ ضرور اندر آئیں گے۔“

جیکٹ والے نے اپنی عینک صاف کی۔ اسے پھر سے لگایا اور پھر تحکمانہ لہجے میں بولا ”سب اپنے اپنے مقام پر اپنا مخصوص پوز بنا کر کھڑے ہو جاؤ۔ یقیناً کوئی ایمر جنسی ہے۔“ موٹر سائیکل والا بولا ”ورنہ اس وقت ناظم کا یہاں آنا.....“

سارے پتلے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہونے کے لیے دوڑے۔

گیلری میں کھڑے پتلے کونوں میں جا کر ڈھیر ہو گئے۔

ہال پر سناٹا طاری ہو گیا۔

آرکیڈ کا صدر دروازہ کھلا۔ ناظم اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے نائب تھا۔ نائب کے پیچھے دس بارہ کاریگر تھے۔ انہوں نے پینٹ کے بڑے ڈبے اور برش اٹھائے ہوئے تھے۔

ناظم کرسی پر بیٹھ گیا۔ نائب اور کارگیر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ”دیکھو اس وقت تین بجے ہیں۔“ ناظم نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ہمارے پاس صرف چھ گھنٹے ہیں۔ حکومت کے معزز مہمان جو دنیاۓ اسلام کے بہت بڑے سربراہ ہیں، ٹھیک ساڑھے نو

بچے آرکیڈ دیکھنے کے لیے آرہے ہیں۔ ان کے آنے سے آدھ گھنٹہ پہلے سارا کام مکمل ہو جانا چاہیے۔ سمجھے! ناظم نے نائب سے مخاطب ہو کر کہا۔

”یس سر“ نائب نے جواب دیا۔ ”اٹ شیل بی ڈن“

”ہوں“ ناظم نے کہا ”ہمارے پرائم سنٹر صاحب کا کہنا ہے کہ معزز مہمان توقع رکھتے ہیں کہ پاکستان کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر پاکستانی رنگ میں رنگا ہوگا اور پاکستانی زندگی، دستکاری اور فن کا مظہر ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ آرکیڈ کی ہر تفصیل پاکستانی ہو۔ سمجھے۔“

”آپ فکر نہ کریں سر۔“ نائب نے کہا

پھر وہ کاریگروں سے مخاطب ہوا۔ دیکھو بھی اتنے تھوڑے وقت میں اتنے شارٹ نوٹس پر ہم نیا سامان مہیا نہیں کر سکتے۔ اس لیے اسی سامان کو رنگ و روغن کر کے گزارہ کرنا ہوگا۔“

”جی صاحب“ کاریگروں نے جواب دیا۔

اگلے روز ساڑھے نو بجے جب معزز مہمان آرکیڈ میں داخل ہوئے تو صدر دروازے کے اوپر فیشن آرکیڈ کی جگہ پاکستان آرکیڈ کا بورڈ لگا تھا۔ اندر دروازے کے عین سامنے اچکن والا بڑے طمطراق سے کھڑا تھا۔ اس کے پاس ہی دائیں طرف رومی ٹوپی والا اپنا پھندا جھلارہا تھا۔ بائیں طرف طرہ باز مونچھ کو تاؤ دے رہا تھا۔ قریب ہی بچے کو انگلی لگائے چادر میں لپیٹی ہوئی خاتون بچے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے پرے کرتے پاجامے والا چھاتی پھلائے استادہ تھا۔

ساڑھی والی لمبا چنڈا لٹکائے لگا ہیں جھکائے لجا رہی تھی۔

سر تھرو چیئٹ کا گھلرا پہنے سر پر پانی کی گاگر رکھے قدم اٹھائے کھڑی تھی۔

سکرٹ والی چست پاجامہ پہنے بازو پر جدید لمبا کوٹ اٹھائے مسکرا رہی تھی۔



ڈائری

۱۲ ستمبر

توبہ کتنی بوریٹ ہے اس گھر میں۔ کچھ ہوتا ہی نہیں یہاں بس روٹین ہی روٹین ہے۔ سامنے بنی سچی تصویرنگی ہے۔ ڈیکوریشن پیس کو کب تک دیکھتا رہے۔

وہ تو شکر ہے سنبل نے مجھے لون لب دکھا دی جہاں سے مڈل ٹن کی بکس مل جاتی ہیں ہئے کتنی رومانٹک سیریز ہے۔ لفظ بدن کے بند بند میں گھس جاتے ہیں۔ جگہ جگہ نکس بجتی ہیں پھر کیاں چلتی ہیں سکر و گھومتے ہیں مینڈک پھدکتے ہیں۔ مزا تو آتا ہے پر فائدہ ساتھ ہی پیسز شروع ہو جاتی ہیں۔ میں تو کتاب ایک طرف رکھ دیتی ہوں پڑھوں کہ بیتوں۔

بھائی کہتے ہیں، بکس ذہن کو روشن کرتی ہیں۔ جھوٹ میرے جسم کو تو جھنجھوڑتی ہیں۔

لومی آگنی۔ توبہ کتنی بنی ٹھنی ہے۔ جیسے فرنی کی پلیٹ پر ورق لگے ہوں۔ ہر وقت خود کو سجاتی رہتی ہے۔ ورق لگاتی رہتی ہے۔ چاہے جتنے ورق لگا لے۔ اندر سے تو وہی ہے نا چمچ بچ، ایسے لگتا ہے جیسے می کا جسم انتقام لے رہا ہے۔ جتنا سیمٹی ہے۔ اتنا پھوٹ پھوٹ کر نکلتا ہے۔ پتہ نہیں کس وجہ سے انتقام لے رہا ہے۔ زیادتیاں کی ہوں گی۔ ہوں گی کا مطلب اب بھی کر رہی ہے۔ ورق جو لگ رہے ہیں۔ ہٹاؤ۔ مجھے کیا لینا دینا۔

لوفون بنجنے لگا۔

کہیں میرا ایسٹ رائنگ نمبر تو نہیں۔

رائنگ نمبر بھی کیا چیز ہے۔ مزے کی ہابی ہے وقت اچھا کتنا ہے۔ جب میں رائنگ نمبر کو چھیڑتی ہوں تو وہ جھنجھنے کی طرح بجتا ہے۔ لائن پر آواز آتی ہے۔ جھن جھن جھن مزے کی بات یہ ہے کہ جو چاہے کہ دو چاہے رعب جھاڑو چاہے گھورو چاہے پیار کی بات کہ دو نہ گبھراہٹ نہ جھجک بس کچھ لوگ چیپ باتیں کرنے لگتے ہیں۔ پھر میں بند کر دیتی ہوں۔

لویہ تومی بول رہی ہے فون پر ڈارلنگ ڈارلنگ کئے جا رہی ہے۔ ڈیڈ کا کیا ہوگا۔

ڈیڈی بے چارے تو اس گھر میں پے انگ گیٹ ہیں۔ گھر والی لینڈ لیڈی تومی ہے۔

مئی ڈیڑی جتنا ایک دوسرے کو ڈارلنگ ڈارلنگ کرتے ہیں سمجھ لو اتنا ہی ایک دوسرے سے دور ہوئے جاتے ہیں۔ ڈیڑی تو ریٹائر ہوئے بیٹھے ہیں۔ مئی نہیں ہوتی ریٹائر۔ کبھی نہیں ہوگی۔ پتے بادام لگتے ہی رہیں گے۔

۱۳ ستمبر

اونہوں اپنا کوئی چانس نہیں۔

پتہ نہیں کیا بات ہے۔ قریب جاتا ہوں تو سب چپ ہو جاتی ہیں۔ قلفی جم جاتی ہے۔ دوسروں سے کہیں مارتی ہیں۔ ہنستی ہیں، کھیلتی ہیں۔ ساتھ گھومتی پھرتی ہیں۔

بس کلاس کے سات آٹھ لڑکے ہیں جن کے ساتھ میل جول ہے۔ پتہ نہیں ان میں کیا ہے۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں دکھتا۔ ذرا بنے بچے ہوتے ہیں۔ انداز مغل، روغنی پتلے لگتے ہیں۔ کلاس میں لڑکیاں ہیں تو سات پر مجھے تو دوا چھی لگتی ہیں۔ ایک تو نک چڑھی سنبل ہے اور دوسری ٹپ ٹپ مومی، نک چڑھی تو بالکل فیوڈل لگتی ہے۔ ڈگنٹی ہی ڈگنٹی، ڈگنٹی کے تھال نیچے اوپر رکھے ہیں۔ جیسے حلوائی کی دکان پر لگے ہوتے ہیں۔

نک چڑھی سے تو بات کرنا مشکل ہے کسی سے لفٹی ہی نہیں۔ ہر وقت تیوڑی چڑھائے رہتی ہے۔ لیکن جب مسکرائے تو پھلجھڑیاں چلتی ہیں۔ ہاں۔

پھر وہ ٹپ ٹپ ہے کیا نام رکھا ہے لڑکوں نے ٹپ ٹپ نام رکھنے میں لڑکوں کا جواب نہیں۔ نک چڑھی، ٹپ ٹپ، لہن، چٹکی، لونڈا، نخرہ، ڈول، ٹپ ٹپ تو ٹپا ٹپ چلتی ہے۔ لٹکے بال، موٹی جین یہ جاوہ جا، دوڑتی زیادہ ہے چلتی کم کم بات میٹر آف فیکٹ۔ پروفیسر نے مذاق سے کہا آج تو غضب کی لگ رہی ہو۔ بولی روز ہی لگتی ہوں۔ کوئی نئی بات کیجئے سر اور بجنل۔ بس ان دونوں میں سے ایک کے ساتھ دوستی ہو جائے اپنی حیثیت بن جائے اور پھر گڈ ٹائم مزا آ جائے۔ ارے یہ تو چاچی آگنی۔ سلام کہتا ہوں چاچی۔

ایک تو محلے بازی نے زچ کر رکھا ہے۔ یہ چاچا ہے وہ ماما ہے۔ یہ پھوپھی ہے۔ وہ تائی ہے۔ سلام کرتے کرتے بور ہو جاتا ہوں۔ پھر یہ گھر۔ اف یہ گھر یہ نہ کرو۔ ادھر نہ جاؤ، ادھر نہ جاؤ، سب محلہ داری کے جھیلے، ہٹاؤ اب اس جھوٹی وضع داری کو، بہت ہولی۔ امی طرف داری نہ کرے تو اپنا بھانڈا پھوٹ جائے۔ ابا کے تو اصول ہی دم لینے نہیں دیتے گھر میں رہنا اک عذاب ہے۔ چٹھی کا دن بھی نہ آئے۔۔۔ بوریت، بوریت، بوریت

۲۰ ستمبر

تو بہ یہ سرتو جونک کی طرح چپک جاتا ہے۔ پاس آئے تو لیس نکلی شروع ہو جاتی ہے تاریں ہی تاریں۔

پتہ نہیں کیا سمجھتا ہے خود کو تربوز سا سر ہے ٹانٹ چمکتی ہے۔ جیسے تیل چپڑ رکھا ہوا دھڑا دھڑا بالوں کے لچھے لٹکتے ہیں۔ کارٹون لگتا ہے۔

ہمارے سر جو ہیں، بس ایک پر یزنٹ ایل ہیں باقی سب لنڈے سے آئے ہیں۔ وہ جو اکنامکس کا ہے نا وہ تو بالکل فلمی ہیرو لگتا ہے میک اپ کر کے آتا ہے۔ جیسے ہیوٹیک سے نکلا ہو۔

مجھے نہیں اچھے لگتے بنے ٹھنے لوگ، وہ لڑکے جو لڑکیوں کے آگے پیچھے پھرتے ہیں وہ تو سارے روغنی ہیں، گھسی پٹی باتیں کرتے ہیں۔ ہاؤڈی سنبل پلیزمس ٹریا پیٹلی ویدر۔

ہمارے اسکارٹ بنے پھرتے ہیں۔ دروازے کھولتے ہیں۔ کوٹ اٹھاتے ہیں۔ رومال بچھاتے ہیں۔ کیئر اور کنسرن سے بھگتے رہتے ہیں۔ ہم کیا موتی چور کے لڈو ہیں یا کریم پنفس۔

باقی لڑکے تو کراؤڈ ہیں۔ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ اکٹھے ہوں تو مانسٹر بن جاتے ہیں۔ اکیلے وکیلے سر لڑکائے پھرتے ہیں۔ آنکھ ملانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ پرانے زمانے لڑکیوں کی طرح بلش کرتے ہیں۔ ویسے جی چاہتا ہے۔ حوصلہ نہیں پڑتا۔

بھڑک کر جلنے والے بھی ہیں۔ انگلیوں پر گن لو۔ بس اتنے ہی۔ گلیڈ آئی چکاتے ہیں۔ سائل پھینکتے ہیں۔ بات بھی کر لیتے ہیں۔ اکھڑی اکھڑی سر کو کہیں دیکھا ہے۔ پیرڈ شروع ہو گیا۔ کل چھٹی ہے کیا سب بہانے بات کرتے وقت نگاہوں کی پھلجھڑی بھی چکاتے ہیں۔ لیکن آگے بڑھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔

لو کراؤڈ ہڑبونگ مچانے لگا۔ جب ہڑبونگ مچاتا ہے تو جو بن پر آ جاتا ہے۔ لکلی گردنیں جیک ان دی باکس کی طرح ڈبے سے نکلتی ہیں۔ سینے تن جاتے ہیں۔ بے زبانوں کو زبان مل جاتی ہے۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔ شور شرابا۔ ہنگامہ ہو۔ کچھ ہو۔ ہوتا رہے۔

ارے یہ تو کسی سیاسی اشو پر ہنگامہ ہے۔ انہیں تو ہنگامے سے دلچسپی ہے۔ اشو کی سمجھ نہیں۔ سیاست تو بہانہ ہے۔ شور اشوری پر مرتے ہیں۔ یہی ان کی پالینکس ہے۔

وہ سامنے جو نعرہ بازی کر رہا ہے۔ کتنی رفنس ہے اس میں رف ہے۔ بائنیٹ ہے ذرا بھی ڈرامیٹک روش نہیں اس میں۔ مجھے رفنس پسند ہے۔ بولڈ ہو رف ہو بانٹ ہو۔

لواب نعرے گونجنے لگے۔ سب تماشہ ہے تماش بینی ہے۔ اور بس یونیورسٹی انہیں سیریس لے لیتی ہے۔ امپارٹنس دیتی ہے خواہ مخواہ وہ سمجھتی ہے یہ پالیٹکس ہے۔ ان کا جلوس دیکھ کر تھر تھر کا ہنپتی ہے۔ پتہ نہیں کیا ہوگا۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بس ہلا گلا ہوگا۔ دس ایک شیشے ٹوٹیں گے۔ چار ایک کرسیاں پھر ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔ جتنی جلدی گرم ہوتے ہیں۔ اتنی جلدی ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں سب سرز کو کراؤ ڈسائیکا لوجی پڑھ کر آنا چاہیے یونیورسٹی میں۔ ارے یہ تو اینڈی آرہا ہے۔

آتے ہی کہے گا چلو ٹک شاپ چلیں۔ ام سو ہنگری بھوک دوکھ کوئی نہیں ہوتی۔ مطلب ہے بہانے بہانے لڑکیوں کو ٹریٹ کرے۔ پتہ نہیں کیا سمجھتا ہے یہ کوک پلا پلا کر پھنسا لے گا۔ ایڈیٹ۔ چلو جو مرضی ہے سمجھے میں تو کوک پینے چلی۔ مفت کی کون چھوڑے۔

۲۴ ستمبر

کیا کر رہی ہے یہ خالہ کی بیٹی فرحتو، خواہ مخواہ آنکھیں منکائے جا رہی ہے۔ ہنستی ہی چلی جا رہی ہے۔ ویسے تو چھوٹے اجی سے کھیل رہی ہے۔ پر اجی تو بہانہ ہے۔ سب کچھ میرے لیے ہو رہا ہے۔ اٹریکٹ کرنے کے کیا کیا کرتے ہیں۔ بات اجی سے کرتی ہے سناقتی مجھے ہے آنکھیں اس سے لڑاتی ہے۔ دکھاتی مجھے ہے۔ منہ اس کا چومتی ہے۔ بھاتی مجھے ہے یہ ڈھنگ پرانے ہو گئے۔ اب نہیں چلتے۔ اپیل نہیں رہی۔ یونیورسٹی میں جانے سے پہلے یہی نخرے کتنے اچھے لگتے تھے مجھے۔ ان دنوں پھوپھی کی بیٹی رضویہ کچھ کیا کرتی تھی۔ پڑوسی کے بچے کو آجا کر کرتی پھر میری طرف دیکھتی سمجھے کیا سمجھے۔

میرا تو برا حال ہو جاتا تھا۔ شور باجو جاتا تھا اپنا۔۔۔ لیکن اب کچھ بھی نہیں ہوتا۔ فرحتو پر ترس ضرور آتا ہے۔

آج کل یہ سب کچھ نہیں چلتا۔ آج کل تو ورکنگ وومن چلتی ہے۔ جین چڑھا لیتی ہے۔ بیگ لٹکا لیتی ہے۔ اور پھر ٹپ ٹاپ یہ جا وہ جا ایسی سارٹنس کی اپیل دیتی ہے کہ دل دھک سے رہ جاتا ہے جو بال نہ لٹک رہے ہوں تو پتہ ہی نہ چلے کہ لڑکی ہے۔

اپنی کلاس کی ٹپ ٹپ جو ہے۔ واہ کیا ٹپ ٹپ ہے۔ یہ آئی وہ گئی۔ ہے بڑے گھر کی پر عوامی بنی پھرتی ہے۔ کچھ بھی کر لو سالی نوٹس ہی نہیں لیتی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالو پڑے ڈالو۔ رجسٹری نہیں کرتی۔ سائیکل بھینکو پہنچتی ہی نہیں۔ کیسے پہنچے پہنچتی ہے تو وہ چھ قدم آگے جا چکی ہوتی ہے۔ کر لو بات۔

بات بھی کر دیکھی۔ چار ایک بار پر بات بنی نہیں میٹر آف فیکٹ جواب دیا اور وہ گئی نہ جھینپتی ہے۔ نہ ہنپتی ہے نہ جھجکتی ہے۔

بھی بات تو ایک بہانہ ہوتی ہے کہ بات سے بات نکلے۔ اس لیے تو نہیں کی جاتی کہ جواب مل جائے۔ انفرمیشن حاصل ہو۔

اور وہ تک چڑھی سنبل وہ تو کاروالوں کی گاہک ہے ہم بات کریں تو ناک پکڑا بن جاتی ہے۔

آج کل ساری لڑکیاں ہی ٹینٹس سیکرز ہیں پہلے لڑکے کو تولتی ہیں بگلہ ہے؟ کار ہے؟ انٹرکان لے جائے گا۔ پھر بات کرتی ہیں۔
رومان کا دور گیا۔ اب نہیں چلتے رومانس اب تو افیروز چلتے ہیں۔ بڑی کیلکولیٹنگ ہو گئی ہیں لڑکیاں ظفر میاں۔۔۔ اپنا کوئی چانس نہیں
کیا مصیبت ہے۔ جہاں چانس ہی چانس ہے وہاں دل نہیں مانتا جہاں نہیں وہاں چل جاتا ہے۔
یہ فرحتو ہی دیکھ لو۔ سبکی سجائی پلیٹ دھری ہے۔ سامنے اور میں۔ میں بھی ایڈیٹ ہوں ایڈیٹ۔

کیم اکتوبر

آج تو حد ہو گئی۔

وہ رانگ نمبر بول پڑا۔

ایک مہینے سے چپ چپ تھا۔

میں ریسیور اٹھا کر ہیلو کہتی تھی تو آگے سے بولتا ہی نہ تھا۔ بس فون کان سے لگائے رہتا۔ میں سمجھتی رہی۔ میری آواز سننا چاہتا ہے
ایک دن میں نے کہا پتہ لکھو ادو تو اپنی آواز ریکارڈ کر کے ٹیپ بھیج دوں یوں کب تک بولتی جاؤں۔
کتاب اٹھا کر کوئی ریسیٹیشن سناؤں۔ غزل سنو گے یا نظم، انگریزی یا اردو پھر میں نے اسے ایک نظم سنائی بھی تھی سویرے جو
کل آنکھ میری کھلی آرام سے سنتا رہا۔ کمبخت ہنستا بھی تو نہیں۔ میں نے بیسیوں باتیں کیں۔ گو نگے ہو۔ ڈرتے ہو۔ بات کرنی نہیں
آتی۔ عشق تو نہیں ہو گیا۔ تنگ آ گئی۔ میں چھوڑ دیتی پر کیور یا سٹی دیمک کی طرح لگی تھی کہ ہے کون۔ اتنا ٹینٹس چپ کیوں لگی ہے۔
چپ دل لگی تو ہونہیں سکتی۔ پردہ ہو سکتی ہے کس بات کا پردہ۔

آج بولا تو پتہ چل گیا۔ اپنی عمر پر پردہ ڈال رہا تھا۔ کتنا مس انفارمڈ ہے۔ بھلا آج کل عمر شرمانے کی چیز ہے کیا اولڈ ایج ٹوفیشن
میں ہے۔

لڑکیاں تاک میں بیٹھی ہیں کہ ایجنڈل جائے۔ بگلہ ہوگا۔ کار ہوگی سٹینس ہوگا۔ اور پھر سپائل تو ایجنڈ ہی کرتے ہیں۔ راج تو ایجنڈ پر
ہی کیا جاسکتا ہے۔ ول اسٹیل ہڈ ہوتے ہیں نا۔

رہی کمپینین شپ جی تو چاہتا ہے کہ کمپینین شپ ہو۔ ہاتھ میں ہاتھ پکڑ کر آوارہ گردی کروں۔ پر خالی خولی کمپینین شپ کو کوئی
چائے کیا۔ وہ یوسف زلیخا کا زمانہ گیا۔ دل کے پیچھے چل کر کھیل ہونے والی بات ہے۔ ایجنڈ ساتھ سب کچھ لاتا ہے۔ کنفرنس بے

فکری، کپڑا لٹا گھڑی، کیا نہیں لاتا۔

بس ایک خطرہ ہوتا ہے۔

ایجنڈا راشکی مزاج کے ہوتے ہیں۔ بات بات پر جلیس ہو جاتے ہیں۔ یا اتنے لیسدار ہوتے ہیں کہ ہر وقت ساتھ چپکے رہتے ہیں۔ ایسوں سے اللہ بچائے۔

کلچرڈ ہو تو سب اچھا آئی مین لارج ہارنڈ۔

تھوڑی سی سکولنگ کرنی پڑتی ہے۔ پھر چاہے ساتھ افیر بھی چلا لو۔ جو یہ سہ جائے تو موج ہو گئی۔ پھر سب کچھ سہ جائے گا۔ سنبل تو مرتی ہے کہ ایجنڈا پھنس جائے۔ ہے سلی گوز بات کہ دیتی ہے۔ اتنا نہیں سمجھتی کہ لڑکیوں میں بڑا ہارڈ کمپینیشن ہے۔ دور سے دیکھو تو لگتا ہے ہاتھ کی انگلیوں کی طرح ساری ایک ہیں اندر سے سب چھریاں نکالے بیٹھی ہیں۔

پرانے دور میں مردوں میں کمپینیشن ہوا کرتا تھا۔ لڑکیاں زیادہ نہیں ہوتی تھیں نا۔ اب ایجوکیٹڈ لڑکیاں زیادہ ہیں۔ سٹیش والے لڑکے کم کم، جیسی تو چھینا جھپٹی لگی رہتی ہے اپنے بوائے فرینڈ کو ہوا نہیں لگنے دیتیں۔ سمجھ لو ایک میڈر لیس چل رہی ہے۔ وہ سنبل سمجھتی ہے میں ایک ورکنگ وومن ہوں اس لیے کمپینیشن میں شامل نہیں۔ نن کم پوپ۔

مجھے تو سنبل پر ترس آتا ہے۔ اتنا نہیں سمجھتی کہ بیگمات کا زمانہ گیا۔ فیوڈل میں اپیل نہیں رہی۔ آج کل تو ورکنگ وومن چلتی ہے۔ بھی عوامی دور ہے۔ پر یہ مطلب نہیں کہ دل سے عوامی بن جاؤ، اونہوں صرف دکھو۔

میں بھی تو عوامی دکھتی ہوں۔ تھیلانکا لیتی ہوں۔ ٹپ ٹپ چلتی ہوں۔ عوامی بن جاؤ تو ایکشن کی ریج بڑھ جاتی ہے۔ وائڈ ری ایکشن ہوتا ہے۔ عام بھی متوجہ ہوتے ہیں خواص بھی۔ کراؤ ڈٹو منہ اٹھا کر دیکھتا ہے۔

بس ایک ہی کاشن ہے۔ دوسرے دیکھیں۔ خود نہ دیکھو۔ بے شک دکھاؤ پر پتہ نہ چلے کہ دکھا رہی ہو۔ دوسرے مسکرائیں خود سیر لیس رہو۔ دوسرے آوازے کیس۔ نوٹس نہ لو، کوئی بات کرے، چپ ہو، کروڈ ہو، رومانٹک ہو، آہستہ ہو، شاکنگ ہو۔ کیسی بھی ہو۔ پڑا کرے۔ میٹر آف فیکٹ جواب دو۔ یوں جیسے رجسٹر ہی نہ کی ہو۔ بس شروع شروع میں دقت ہوتی ہے۔ پھر چل نکلتی ہے۔

لوراٹنگ نمبر پھر بولا۔

کوئی ایسی بات کروں کہ انوائٹ کر لے۔ دیکھوں تو کیسا ہے۔ کیسا بھی ہو۔ ماسنڈ نہیں کرتی۔ پر دیکھوں، سہ جانے والا ہے کہ نہیں۔

۱۸ اکتوبر

کل تو حد ہو گئی۔ کمال کر دیا پنٹھی نے۔ یقین نہیں آتا۔ ابھی تک نہیں آیا۔

خالد سے بازی لگی تھی۔ شرط بدھی تھی۔ جو ہارے کارن سوپ کھلائے۔ کارن سوپ بہت پسند ہے مجھے بڑا مہنگا بیچتے ہیں۔ ورنہ روز کھاؤں خالد ہار گیا۔ بولا آج شام کو چھ بجے وانگ چو' میں نے کہا اوکے' مگر غچہ دے گیا۔ پہنچا نہیں۔ اچھا ہی ہوا کہ غچہ دے گیا۔ پہلے تو میں باہر انتظار کرتا رہا پھر سوچا چلو آیا ہوں تو ایک کوک ہی پیتا چلوں۔

اندر داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ٹپ ٹپ بیٹھی ہے۔ ساتھ کوئی تھا۔ انکل قسم کی چیز سوچا چلو میز کے پاس سے گزرو۔ ہلکی سی وش کرتے چلو۔

وش کی تو بولی، ہیلو

میرا خیال تھا منہ پھیر لے گی یا زیادہ سے زیادہ ہلکی سی مسکراہٹ۔

مومی نے ہیلو کہا تو انکل اٹھ بیٹھا ہاتھ بڑھا دیا۔ فاروقی ہم نے بھی دبا کر ہاتھ ملایا۔ ظفر۔ وہ بولی۔ مائی کلاس فیلو۔

اس پر انکل بولا۔ اف یو لائیک ٹو جائن اس۔ اندھے کو کیا چاہے۔ ڈٹ کر بیٹھ گیا۔

پھر کیا تھا وہ اس سے باتیں کرتی رہی وہ مجھ سے بات کرتا رہا اور کارن سوپ مفت کارن سوپ کیا۔ سویٹ اینڈ ساور بیف اینڈ چلیز اور پتہ نہیں کیا کیا۔ کبھی کھائے ہوں تو نام جانوں۔

بس ابھی آج کچھ اور سو جھٹائی نہیں۔

یوں بیٹھا ہوں جیسے چوہے نے بھنگ پی رکھی ہو۔

۱۰ دسمبر

حد ہو گئی۔ یہ فاروقی دکھتا کیا تھا نکلا کیا۔ اوپر سے اتنا ڈرامینگ روش تھا۔ گڈ ٹائمز دکھتا تھا۔ اندر سے اتنا سیریس مانیٹڈ اتنا

سنگل ٹریک وہ تو مر مرنا کہتا ہے ایک سال سے پیچھا کر رہا تھا۔ کہتا ہے شادی کر لو ابھی ابھی اسی وقت جلدی

صاف دکھتا ہے۔ جو کہوں گی مانے گا۔ سب کچھ سہ جائے گا۔ سب کچھ

اونہوں جیلس ٹائپ نہیں، الٹا ٹارینٹ ہے عجیب کمی نیشن ہے۔ خوش مزاج ہے افسٹنیٹ ہے۔ ایج کا مپکس ہے۔ یہ بات تو

اپنے حق میں ہے نا۔ قائم ہی رہے تو اچھا۔ لے کے رہیں گے والی ضد ہے۔ آوے ہی آوے قسم کا کانفی ڈنس بھی ہے۔ تھوڑی سی توجہ ضرور مانگتا ہے۔ ساری نہیں تھوڑی سی۔

میں بھی کیسی احمق ہوں۔ سوچ رہی تھی جو سوٹ نہ کیا تو پلیٹ رکھ کر سنبل کو پیش کر دوں گی۔

یہاں تو بات ہی اور نکلی۔ یہ تو میرا دیوانہ نکلا پرسل۔ سوٹ تو کرتا ہے۔ پتہ نہیں گھبراہٹ سی کیوں محسوس ہو رہی ہے۔ ڈی سین نہیں کر پائی اور وہ ظفر..... بالکل ہی گرین یوتھ نکلا اتنا کچا۔ پہلے تو فارو کو انکل سمجھتا رہا۔ ایڈیٹ اسے سرسر کرتا رہا۔ فارو کو پسینہ آ جاتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عمر کی دیوار ٹوٹے یہ سرسر کر کے کھڑی کئے جا رہا تھا۔ پہلی ملاقاتوں میں تو بڑی رڈیکولس پوزیشن رہی پھر سمجھ گیا۔ ہے تیز بڑا بولڈ ہے۔ اب اسے یار یار کرنے لگا ہے۔ فارو بڑا خوش ہے اس پر کچھ مچ ظفر کو یار بنا بیٹھا ہے۔

مجھے نہیں پتہ تھا کہ ظفر اتنا کلر فل ہے۔ میں سمجھتی تھی اکھڑا اکھڑا رہے گا۔ وہ تو گھل مل گیا۔ کیا نہیں اس میں سبھی کچھ ہے۔ رف نس ہے۔ بے تکلفی ہے۔ ڈیرنگ ہے۔ گڈنا کر ہے انٹیلی جنٹ ہے۔ آنکھیں بڑی مرچیلی ہیں۔ تین سیکنڈ دیکھ لے تو سی سی کرنے لگو۔ ساتھی تو بہت ہی اچھا ہے۔ انگلی پکڑے پھرو۔ لیکن ہے جذباتی ڈر لگا رہتا ہے کہ دھرنا مار کر نہ بیٹھ جائے۔

کل سینما ہال میں فاروقی میرا ہاتھ پکڑ کر بیٹھا رہا۔ کتنی چالاک بات ہے۔ خالی ہاتھ پکڑ کر بیٹھ رہنا اور پھر یوں جیسے خزانہ مل گیا ہو۔

میں سمجھی کچھ کرے گا دبائے گا۔ جھٹکے گا۔ مروڑے گا یا شاید۔۔۔ لیکن خالی پکڑ کر بیٹھا رہا۔ میراجی چاہا دوسرا ہاتھ ظفر کو تھادوں۔ شکر ہے میں نے پکڑا یا نہیں۔ ورنہ دودن کے لیے ٹکڑ کر کرنی پڑتی۔ نہ نہ نہ ظفر کو این کرج نہیں کرنا۔ ابھی نہیں۔ مس انڈر سٹینڈ کر لے گا۔ پتہ نہیں کیا سمجھ لے لڑ بڑ ہو جائے گا۔

ویسے ساتھی کتنا اچھا ہے۔ اچھا کیا اعلیٰ ہاتھ پکڑا دو ملکوں ملک گھومو پھر وزیرین پرسو، کھنڈروں میں رہو۔ ایڈ ونچر ہی ایڈ ونچر۔ اب اپنی پرابلم تو صرف یہ ہے کہ کیا کروں۔ کیا فاروقی کا پروپوزل مان لوں۔ ابھی سے آباد ہو جاؤں یا کچھ دیر اور ٹپاٹپ نہ کروں۔

بس صرف ڈیسی ٹن کرنے کی بات ہے۔ پھر نو پرابلم امی تو سن کر خوشی سے ناچے گی۔ اسے تو بس ایک ہی ڈر لگا ہے۔ کہیں میں دل کے ہاتھوں مجبور نہ ہو جاؤں رومانٹک رشتہ کرنے پر نہ بچل جاؤں۔ جانتی ہے نا کہ میں ضدی ہوں اڑ گئی تو اڑ گئی۔ می کو فاروقی کا پتہ چلا تو ناچنے لگے گی خوشی سے۔ کیوں نہ ناچے۔ می کو مزید سٹیٹس مل جائے گا۔

ملاقات کا حلقہ وسیع ہو جائے گا۔ نئے کاشیکٹ۔ رہے ڈیڈی تو وہ میٹری نہیں کرتے۔ حیرت سے سراٹھائیں گے۔ ممی کے تیور دیکھیں گے اور پھر جھکالیں گے۔

مجھے ایسے لگتا ہے جیسے ڈیڈی اب سوشل لائف کو فائنل سمجھنے لگے ہیں۔ فرسٹریشن محسوس کرتے ہیں۔ سارا قصور ممی کا ہے ممی توجہ دے تو ٹھیک ہو جائیں۔ ممی توجہ کیسے دے وہ تو خود توجہ طلبی کا شکار ہے۔ پتے بادام ایسے تو نہیں لگتے رہتے۔
لوممی آگئی۔

ارے یہ کیا سیدھی میں ری طرف کیوں آ رہی ہے۔ آج بات کیا ہے۔ روز تو۔۔۔ سیدھی میک اپ ٹیبل کی طرف جایا کرتی ہے۔

ہائیں۔۔۔ اتنی نیمنگ نگاہ سے دیکھ رہی ہے مجھے۔ ضرور کوئی بات ہے۔۔۔ اوہ ضرور اسے فاروقی کا پتہ چل گیا ہے۔ اوں ہوں۔

بات نکل گئی۔

چلو اچھا ہی ہوا۔ فیصلہ کرنے کی مصیبت سے جان چھوٹی چل مومی برائیڈ بننے کی تیاری کر، جوان لڑکیاں گھر سے وداع ہوں تو میاں خوش ہوتی ہیں۔ ممی کی خوشی تو دوہری ہے نا۔
جی ممی۔۔۔ آئی۔

۲۱ جولائی

چلو جی چٹھی ہوئی۔ مومی مسز فاروقی بن گئی۔

ہم نے ولیمہ بھی اڑا لیا۔ قصہ ختم ہوا۔

پہلے تو میں اسے انکل سمجھتا رہا۔ مجھے کیا پتہ اس روز سینما ہال میں ہاتھ پکڑے بیٹھے تھے۔ بات سمجھ میں آ گئی۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ مجھے کیوں انوائیٹ کیا جا رہا ہے۔ کبھی فلم پر کبھی انٹرکان کبھی کہیں کبھی کہیں۔

مجھے کیا پتہ کہ وہ تو مجھے استعمال میں لا رہی ہے۔ وہ تو جلدی پتہ چل گیا ورنہ اپنا کباڑہ ہو جاتا۔۔۔ خیر اس نے مجھے استعمال کیا ہے تو میں فاروقی کو کروں گا۔ میں کب بخشنے والا ہوں۔

ویسے آدمی بہت اچھا ہے۔ بڑا افسر ہونے کے باوجود ہے سنسیر۔ یار باش ہے۔ محبت سے ملتا ہے۔ دوج نہیں رکھتا۔ میں نے

بھی وہ بے تکلفی چلا رکھی ہے کہ کبھی نکلنے نہ پائے گا۔ جاب دلائے گا۔ اچھا گریڈ اونچا سا ریکورسٹ کرنے کی ضرورت نہیں دیکھنا آپ ہی آپ کرے گا۔

شادی سے پہلے مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ کیوں ظفر میں شادی کر لوں کیا خیال ہے ادھیڑ سے کروں یا نو جوان سے مومی کیسی رہے گی۔ مان جائے گی کیا۔ تم تو اس کے دوست ہو ذرا اندازہ لگاؤ۔

شادی ہو گئی تو میں نے پوچھا۔ فاروقی کیسی رہی بولا۔ فی الحال تو مزے کی ہے۔

پہلے تو میں مومی کے دوست کی حیثیت سے ملتا تھا۔ اب فاروقی کے دوست کی حیثیت سے مومی کے گھر جاتا ہوں۔

اونہوں اب مومی وہ مومی نہیں رہی۔ وہ بیگم بن گئی ہے۔ جھلمل ساڑھیاں، ریشمی سوٹ بندے ہار، چوڑیاں یہ ٹوکرا بال۔ نہ وہ جین رہی نہ لکٹے بال نہ تھیلا نہ ٹپ نہ یہ جاوہ جامیٹر آف بات اب تو لبھا لبھا کر بات کرتی ہے۔ آنکھیں مڑکاتی ہے گھورتی نہیں مسکاتی ہے۔

اب اپنے کو کوئی انٹرسٹ نہیں رہا۔ جو ایئر ہی چلانا ہے۔ تو وہ رہی سامنے فرحتو، کب سے ایک بھر پور نگاہ کی منتظر بیٹھی ہے۔ اک نگاہ ڈالوں تو دو دن دھواں دیتی رہے۔

میاں ظفر اب گھر آ جاؤ۔ کوئی سنبل مومی نہیں ملے گی تجھے، کوئی فرحتو ہی آئے گی۔ تیرا گھر آباد کرنے کے لیے۔ باورچن کی باورچن بیوی کی بیوی ٹھیک ہے چلتا ہے رہا جاب اور گریڈ کا مسئلہ۔ وہ فاروقی جو ہے۔ نو پر اہلم مائی ڈیر۔

۶ فروری

میں تو خواہ مخواہ ڈرتی تھی۔ سوچتی، پتہ نہیں۔ میر ڈائف کیسی ہوگی۔ خواہ مخواہ جان ڈالتی رہتی۔ یہ تو کچھ مشکل نہیں نو پر اہلم ایٹ آل۔

بس میاں کو تھوڑی سی توجہ دینی پڑتی ہے۔ ایک الوژن کھڑی کر دو۔ بہلا دو۔ جیسے بچے کو سویٹ سے بہلا دیا بس پھر سب اچھا۔ اچھا کیا اعلیٰ پھر پرولچر ہی پرولچر ڈریسز، کفرٹس، لکڑی، سب کچھ کتنی خوش ہوں میں۔

نو باورنوری نو پر اہلم۔ یوں ہوں۔ جیسے گلدستہ سجا ہوا فلاور پاٹ میں۔۔۔ جب بھی جی چاہے سو جاؤ۔ جب جی چاہے جاگو۔ لپز آل دی ڈے یا گوا باؤٹ، کہیں چلے جاؤ۔ جہاں جی چاہے۔ سوشل وزٹ، کلب، سینما، انٹرکان، ڈرائیو، وانگ، چو نمائش، چاہے اکیلی چاہے فارو کو ساتھ لے جاؤں۔ بس ایک پیار بھری نگاہ اک بھر پور انٹینشن، امپلسٹ کنسرن، پھر وہ خود بخود پیچھے پیچھے چل پڑتا ہے۔ بڑا

منڈ رہے۔ ایکشنیٹ لیپ ڈاگ بنالو۔ جب جی چاہے آ۔۔۔ واٹ پیس۔

کبھی کبھی تو میں اس فلاوران دی واز زندگی سے گھبرا جاتی ہوں۔ جی چاہتا ہے۔ کوئی پر اہلم ہو، کوئی مشکل ہو، سڑگل ہو۔ پھر سے جین چڑھا کر تھیلا لٹکا کر سڑکوں پر مارا ماری کرتی پھروں ساتھ کوئی ساتھی ہو۔ لیپ ڈاگ نہیں۔ یس ڈارلنگ نہیں۔ رف ہو۔ اجلانہ ہو۔ جان ہوا دھ ہو، ڈرائیونگ رومی نہیں۔ گرین یوتھ ہو۔ روغنی پتلانہ ہو آگے پیچھے پھرنے والا نہیں، پھرانے والا۔

کتنا احمق نکلا وہ ظفر میدان چھوڑ گیا نہیں تو۔۔۔ چلو چھوڑو ہٹاؤ نہیں نہیں میں خوش ہوں۔ بہت خوش، بہت ہی۔

مجھے کیا میسر نہیں، کس چیز کی کمی ہے۔ افلو اینس ہی افلو اینس، آرام، اقتدار، نہیں نہیں میں کیا بے وقوف ہوں کہ کسی کے آگے پیچھے پھرنے کی خواہش کروں۔ جسے خود آگے پیچھے پھرنے والا میسر ہو وہ۔۔۔ وہ کیوں آگے پیچھے پھرنے کی خواہش کرے بھلا۔
اونہوں۔ کچی یوتھ کو کیا کرنا ہے۔ خواہ مخواہ خود کو کانٹوں میں گھسیٹنا۔۔۔ کوئی بات ہے بھلا۔ اور پکشن۔۔۔ پکشن تو تیز دھار ہوتی ہے۔ اللہ بچائے۔

میں تو اتنی خوش ہوں اتنی خوش ہوں، میرا جی چاہتا ہے رو دوں۔



اپسرا حویلی

نل بجنے پر پریم دیوتا چو نکے۔ ”اس وقت کون ہو سکتا ہے بھلا۔“

شش سیوک بولا۔ ”کوئی فریادی ہوگا مہاراج۔“

”اس سے فریادی!“ پریم دیوتا ماتھے پر تیوری چڑھا کر بولے۔

”مہاراج،“ شش سیوک نے کہا۔ ”فریاد کا کوئی سے نہیں ہوتا۔“

”اچھا تو فریادی کو حاضر کرو۔“ دیوتا خشمگیں لہجے میں بولے۔

”نہ مہاراج۔“ شش نے سر لٹکا لیا۔ ”جد ماتھے پر بل ہوں اور من میں کرو دھ ہو وہ سے فریاد سننے کا نہیں ہوتا۔“

دیوتا چو نکے۔ مسکرا کر بولے ”تو کون سا سے ہوتا ہے۔“ سیوک شش بولا مہاراج، ”جد من شانت ہو۔ جد کڑوی کیلی بے سواد نہ

کرے۔ جد ردھے کان ہی کان بن جائے۔ جد سننے والا خود فریادی بن جائے۔ دونوں میں دوج نہ رہے۔ وہ سے فریاد سننے کا ہوتا

ہے۔ مہاراج۔

پریم دیوتا نے جواب دینے کے لئے سر اٹھایا۔ دیکھا کہ سامنے دروازے میں ایک عورت سر جھکائے چھوٹی موٹی کھڑی ہے۔

تم کون ہو؟ دیوتا نے پوچھا۔

میں فریاد بن ہوں مہاراج۔ عورت نے ہاتھ موڑ کر کہا۔

بول کیا مانگتی ہے فریاد بن؟

کچھ بھی نہیں مانگتی مہاراج۔

آپ ہی کہتی ہے۔ فریاد بن ہوں۔

میری فریاد میں مانگ نہیں مہاراج۔

شش سیوک یہ کیا کہہ رہی ہے۔ دیوتا نے پوچھا۔

مہاراج شش نے جواب دیا۔ فریاد میں مانگ ہوتی ہے پر ضروری نہیں کہ ہو۔

دیوتا نے سر جھکا لیا۔ بولے اچھا تو بول فریادن تو کیا کہنا چاہتی ہے۔

فریادن نے کہا مہاراج میں استری ہوں۔ میں لاج ہوں۔ سیوا ہوں۔ پتی بھگتی ہوں۔ متا ہوں۔ آپ نے میرے ہاتھ میں عورت کی بانہہ پکڑائی تھی اور کہا تھا اس کے انگ انگ میں رچی رہنا۔ اس کی ہر سانس میں اپنی مہک گھولنا۔ ہر آن اسے تھامے رکھنا جس طرح گھوڑی کو لگام تھامے ہے۔

ہاں ہاں پھر دیوتا نے پوچھا۔

مہاراج میں نے ویسے ہی کیا جیسے آپ نے کہا تھا۔ پر آج عورت نے مجھے دھتکار دیا ہے۔ کہتی ہے میں نے سارے بندھن توڑ دیئے ہیں۔ میں آزاد ہو گئی ہوں۔ مجھے کوئی سنگ سہارا نہیں چاہیے۔

نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ دیوتا بولے۔ ہم نے تو استری کے روہے کے بند بند میں تجھے رچا بسا دیا تھا۔ پھر وہ تجھے کیسے نکال پھینک سکتی ہے۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔

ایسا ہو گیا ہے مہاراج۔ فریادن نے ہاتھ موڑ کر کہا۔

لیکن پھول سے مہک کیسے الگ ہو سکتی ہے۔

مہاراج پھول نے مہک کو تیاگ کر رنگ کو اپنا لیا ہے۔ مدھم کو چھوڑ کر بھڑک کو اٹھا لیا ہے۔

شش سیوک سن رہے ہو۔ یہ کیا کہہ رہی ہے۔

سن رہا ہوں مہاراج۔ شش بولا۔

جو استری میں لاج، ممتا نہ رہی تو وہ استری کیسے رہے گی۔ استری نہ رہے تو کیا بن پائے گی۔ دیوتا گویا اپنے آپ سے بولے۔

مہاراج فریادن نے کہا۔ مجھے نہیں پتہ کہ وہ کیا بن گئی ہے۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ اس نے مجھے تیاگ کر بن باسی بنا دیا ہے۔ میں دکھڑا نہیں روتی مہاراج۔ مجھے اس سے لاگ نہیں لگاؤ نہیں۔ میں تو صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ اب میرے لئے کیا آگیا ہے۔

تو نہیں سمجھتی فریادن۔ دیوتا نے کہا۔ اگر استری نے تجھے تیاگ دیا ہے۔ اگر اس میں استری پن نہیں رہا تو سمجھ لو وہ استری نہیں رہی۔ اگر استری استری نہ رہے گی تو پھر پرش بھی پرش نہیں رہے گا اور پریشور نے جو استری اور پرش کے بیچ پریم بندھن کا ناطہ بنا رکھا ہے۔ وہ ٹوٹ جائے گا۔

مہاراج شش بولا۔ پریم بندھن تو پر میثور کی اک چال ہے۔ اک چلتر ہے جس کے زور پر جیون کی تجھری بھری رہتی ہے۔ موت کی چپکن اسے خالی نہیں کر پاتی۔

چال ہی سہی پرنتو۔ دیوتانے کہا اگر ایسا ہو گیا تو سنسار میں جیون کی ندی سوکھ جائے گی۔
ایسا ہونے کو ہے مہاراج۔ فریادن چلائی۔

فریادن تم اب جاؤ یہاں پاٹ شالا میں رکی رہو۔ ہم پتہ کرتے ہیں۔ پھر تم سے بات کریں گے۔
فریادن کے جانے کے بعد وہ شش سیوک سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

شش تم دھرتی پر اترو۔ راج نانکے سے ملو۔ اس سے بھید لو۔ اس کے پاس بھانت بھانت کا پرش آتا ہے اور جو کچھ اوہ لے کر آتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ گھر گھر سستی کس حال میں ہے۔ راج نانکے مرد اور عورت دونوں کے بھید جانتی ہے۔

جب شش سیوک راج نانکے سے ملنے اپسرا حویلی میں پہنچا تو ابھی شام نہیں پڑی تھی۔ اس نے دیکھا کہ بہت سی نوجوان طوائفیں اپنی اپنی چوکی پر بیٹھی ہار سنگھار میں مصروف ہیں۔ ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے باتیں کر رہی ہیں۔ چہلمیں کر رہی ہیں۔
اس وقت شش نے ایک بوڑھے رئیس عیاش کا بھیس بدل رکھا تھا۔

اسے داخل ہوتے دیکھ کر ایک طوائف نے منہ موڑ لیا۔ دوسری نے ناک چڑھائی۔ تیسری کی بھویں سکڑ کر کمان بن گئیں۔ چوتھی منہ پر ہاتھ رکھ کر تحقیر سے ہنس دی۔

یہ دیکھ کر شش کا ماتھا ٹھکا۔ یہ میں کہاں آ گیا ہوں۔ یہ اپسرا حویلی نہیں دکھتی۔ یہاں تو رنگ ہی کچھ اور ہے۔

رنڈی کا کام تو گا ہک کا سواگت کرنا ہوتا ہے۔ پرش کو لبھانا ہوتا ہے۔ اسے مائل کرنا ہوتا ہے۔ اس کے اندر کے بالک کو جگانا ہوتا ہے۔ اسے کھیلنے پر اکسانا ہوتا ہے۔ چاہے وہ جوان ہو یا بوڑھا۔ بوڑھے کو تو بہتا دھیان دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ دھن کے زور پر آتا ہے اور بوڑھے میں لہجہ زیادہ ہوتا ہے۔ رنڈی کا تو کام ہی یہی ہے کہ منش میں لہجہ جگائے اور پھر روپیہ بنوے۔

ہے بھگوان یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ رنڈی گا ہک کو دیکھ کر ناک چڑھا رہی ہے۔ منہ موڑ رہی ہے۔ شش مڑ کر باہر نکلنے کو ہی تھا کہ ایک کونے سے ادھیڑ عمر کی نانکہ شرنو اس کے پاس آئی۔ بولی آئیے جناب آئیے تشریف لائیے میں آپ کی کیا سیوا کر سکتی ہوں۔

دیوی یہ اپسرا حویلی ہے کیا شش نے پوچھا۔

شرنو نے نووارد کی بات سنی تو اپنا طرز کلام بدل کر بولی۔

ہاں مہاراج پدہارے پدہارے۔ جی آیاں نوں۔ آؤ مہاراج بیٹھ کے بات کرو۔ کس لئے یہاں آ کر ہماری شو بھاڑھائی۔ سر سنگیت کے رسیا ہو تو بتاؤ۔ ناچ نہت چاہو ہو تو جو بنا کے پجاری ہو تو بانگن کے گا ہک ہو تو۔ مہاراج حویلی میں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر موجود ہے۔ جو چاہو جیسی چاہو بس اک بار حکم دو۔ یہ سن کر شش سیوک بیٹھ گیا۔ شرنو وہ بولا جب میں نے حویلی میں پاؤں دھرا اور میں نے دیکھا کہ ان الہڑنڈیوں نے منہ موڑ لیا ہے تو مجھے وسواس ہوا کہ میں بھول سے کسی اور جگہ آ گیا ہوں۔

شرنو مسکرا کر بولی۔ مہاراج حویلی کے وہ پرانے طور طریقے بیت گئے۔ اب طوائف وہ طوائف نہیں رہی۔ اس نے کینچلی بدل لی ہے۔ روپ بھگت سچ کہتی تھی کہ جب طوائف میں ”میں“ جا گئے گی تو سمجھ لینا کہ کلجگ آ گیا۔

روپ بھگت کون تھی۔ شش نے پوچھا۔

مہاراج وہ راجہ عندلیب راؤ کی پتری تھی۔ جب جوان ہوئی تو پتہ نہیں من میں کیا سمایا کہ راج محل کو چھوڑ کر بھگتی کے لئے چل نکلی۔ سولہ سال بھگتی میں گزارے۔ پھر گردو آتما دیو کے پاس پہنچی۔ بولی مہاراج سولہ سال کی بھگتی کے بعد مجھے پتہ چلا کہ جب تک من مندر پر ”میں“ کا کلس چڑھا ہے بھگتی اندھی گلی کی سامان کسی اور نہیں جائے گی۔ اب بولو مہاراج ”میں“ مارن کے لئے میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔

گردو یو بولے۔ روپ تو راجہ کی پتری ہے۔ محل میں پلی ہے۔ خود کو دو جوں سے اونچا سمجھنا تیری ہڈی میں رچا ہے۔ تیری ”میں“ ایسے کیسے نہیں جائے گی۔ بھگت بولی جو میں راجہ کی پتری ہوں تو اس میں میرا کیا دوش ہے۔ گردو یو جس بات پر میرا بس نہیں وہ میرے راستے کا پتھر کیوں بنے مہاراج۔

گردو یو سوچ میں پڑ گئے۔ پھر سر اٹھا کر بولے تیرے لئے دھرتی پر ”میں“ کو نچوڑ نکالنے کی صرف ایک جگہ ہے۔ وہاں جائے گی کیا۔

روپ بولی جاؤں گی مہاراج چاہے وہ پاتال ہی کیوں نہ ہو۔ گردو مسکائے کہنے لگے۔ وہاں نیچ بن کر رہنا ہوگا۔

رہوں گی مہاراج۔ روپ نے جواب دیا۔

اچھا تو اپسرا حویلی میں چلی جا اور رنڈی بن جا۔

روپ نے گبھرا کر گردو یو کی طرف دیکھا۔ کیا کہا مہاراج گردو یو نے۔ گبھرا گئی نا۔ تو رنڈی کے ظاہر پر نہ جا۔ ظاہر میں وہ نرج ہے۔ ہوس کی ماری ہوئی دکھتی ہے۔ پر اس کا ایک اندر کا روپ بھی ہے۔ رنڈی خود کے لئے نہیں دو جوں کے لئے جیتی ہے۔ دو جوں کو

خوش کرنا اس کا دھرم ہے۔ دو جا چاہے اجلا ہو یا میلا۔ لڑا کا ہو یا پریمی۔ دھن وان ہو یا اچکا۔ سڑی ہو یا ہنسوڑ۔ اس گھاٹ کا متوالا ہو یا اس گھاٹ کا۔ کوئی بھی ہو۔ کیسا ہی ہو وہ اسے خوش کرتی ہے۔ چاہے اپنا من جل جائے۔ چاہے اپنی پریم جھری پھوٹ جائے۔ وہ اپنی ”میں“ کو تیاگ دیتی ہے۔ بس وہی ایک جگہ ہے جہاں تیری ”میں“ کا پھوڑا پھوٹ سکتا ہے۔ پرنتو ایک بات یاد رکھنا۔ اوٹ۔ اپنے گاہکوں سے جتنا پیسہ بٹور سکے بٹورنا۔ پر اسے اپنے پاس نہ رکھنا۔ اسے اپنا نہ جاننا۔ اسے ہاتھ نہ لگانا اور جو ہاتھ لگائے تو صرف دو جوں میں بانٹنے کے لئے وہ تھی روپ بھگت مہاراج۔ شرنو نے کہا۔ وہ یہاں آئی۔ پورا ایک سال یہاں رہی اور جاتے سے کہنے لگی۔ شرنو۔ اب سے بدل رہا ہے۔ رنڈی میں ”میں“ ابھر رہی ہے۔ اور تو جان لے جب رنڈی میں ”میں“ ابھر آئی۔ جدوہ اپنی مرضی سے سوچنے لگی تو سمجھ لینا کھجک آ گیا۔

سچ کہتی تھی۔ روپ بھگت۔ شش نے ہنکارا بھرا۔

مہاراج، شرنو بولی، رنڈی تو پانی سامان ہووے ہے چاہے اسے پیالے میں ڈال لو چاہے کٹوری میں، ہر روپ میں ہر رنگ میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ بن جاتی ہے جو دو جا چاہے ہے۔ دو جا بیٹھے کا رسیا ہو تو مٹھاس بن جاتی ہے۔ دو جا سی سی کرنے کا متوالہ ہو تو مرج بن جاتی ہے۔ اس کا اپنا کوئی سوا ونہیں ہوتا مہاراج۔

شرنو اب تو رنڈی کا وہ رنگ نہیں رہا جس کی تو بات کر رہی ہے۔ شش نے نو جوان رنڈیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ پھر وہ اٹھ بیٹھا۔ بولا تیرے پاس سے اٹھ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ پر مجھے راج نانکہ سے ملنا ہے۔

یہ سن کر شرنو پھر اٹھ بیٹھی۔ پد ہارے مہاراج کہہ کر وہ راج نانکہ کی طرف چل پڑی۔

راج نانکہ کے منہ پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ بال کھجڑی ہو رہے تھے۔ پھر بھی وہ ریشمی کپڑے پہنے زیور لگائے بیٹھی اپنے بال سکھا رہی تھی۔

شش کو آتے دیکھ کر اس نے جلدی جلدی کھلے بالوں کا جوڑا بنایا اور اٹھ کر شش کا سواگت کیا۔ جب شرنو چلی گئی تو شش نے اپنی جیب سے سونے کا کڑا نکالا۔ بولا یہ تمہاری بھینٹ ہے دیوی۔ سونے کو دیکھ کر راج نانکہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ بولی اس کی کیا ضرورت تھی مہاراج میں تو ویسے ہی باندی ہوں۔ حکم کرو کیا چاہتے ہو۔ میں تو آپ کی سیوا کے لئے یہاں بیٹھی ہوں۔ بلکہ آپ نے خود آنے کی تکلیف کیوں کی۔ مجھے بلوا بھیجتے۔ شش کو پیہ چل گیا کہ سونا کام کر گیا۔ بولا۔ دیوی۔ پیاسا ہی کنویں کے پاس آتا ہے۔

راج نانکہ مسکرائی کہنے لگی تو بولو مہاراج کو کیسی پیاس ہے کس کی پیاس ہے۔ کسی پر من سمجھ گیا ہے یا کسی کو گھر ڈالنے کا دھیان

ہے۔

شش نے جواب دیا میری پیاس کچھ اور ہے دیوی۔ میں تو تیرے پاس اس طرح آیا ہوں جیسے بالک گرو کے پاس جاتا ہے۔ میں تو تیرے دو بار بدھی کی تلاش میں آیا ہوں۔ سچ کی ڈھونڈ کرنے آیا ہوں۔

راج نانکھ کے ماتھے پر سوچ کی تیوری پڑ گئی۔ دیر تک وہ سرنوائے بیٹھی رہی۔ پھر سر اٹھا کر بولی۔

مہاراج جو سچ کی ڈھونڈ میں ہو تو کسی رشی منی کے پاس جاؤ۔ نانکھ تو سچ سے منہ موڑ کر بیٹھی ہے۔ جو بدھی کی تلاش ہے تو کسی ودھوان کی پاس جاؤ کسی عالم کو ڈھونڈو۔ شش بولا۔ نہ دیوی مجھے پڑھی پڑھائی سنی سنائی بدھی نہیں چاہیے۔ اس لئے میں تیرے پاس آیا ہوں۔ تیرے پاس بیٹی بدھی ہے۔ تو نے جیون کو بیت کر دیکھا ہے۔

مہاراج کئی قسم کی دانائی ہوتی ہے۔ آپ کو کون سی دانائی کی تلاش ہے۔ نانکھ نے پوچھا۔

مجھے مرد اور عورت کے آپس کے ناٹے کا بھید جاننا ہے۔ شش نے جواب دیا۔

راج نانکھ پھر سوچ میں پڑ گئی۔ حیران تھی کہ یہ کیسا مرد ہے جو پھول کی خوشبو سے محفوظ ہونے کی نہیں سوچ رہا۔ اس کا بھید پانے کی خواہش لئے بیٹھا ہے۔ مرد کا کام تو عورت سے خوشی حاصل کرنا ہے۔ اس کا بھید پانا نہیں۔ پر اس نے خود کو سنبھالا اور کہنے لگی۔ نانکھ بھلا عورت کا بھید کیسے پاسکتی ہے مہاراج۔

نانکھ بھی تو عورت ہی ہوتی ہے۔ شش نے کہا۔

بڑا فرق ہوتا ہے مہاراج۔

وہ کیسے۔ شش نے پوچھا۔

ذرا سوچو مہاراج مرد گھر کی استری کو چھوڑ کر طوائف کے پاس کیوں آتا ہے۔ نانکھ نے کہا۔ اگر عورت اور طوائف میں فرق نہ ہو تو کیوں آئے سچ کہتی ہو۔ شش نے سر ہلا دیا۔ شش کا مقصد تو یہی تھا کہ راج نانکھ باتیں کئے جائے کئے جائے اور پھر ان میں سے وہ اپنے مطلب کی باتیں چن لے بڑا فرق ہے مہاراج۔ راج نانکھ نے کہا۔ گھر کی عورت سہتی زیادہ ہے کہتی کم کم ہے۔ پریم لگن بیتے زیادہ ہے جناوے کم کم ہے۔ جلے تو ہے پر بھڑک کر نہیں جلے ہے۔ مدھم مدھم۔ اندر اندر بھیڑ لگی ہووے ہے اوپر شانت دکھے ہے۔ اپنی خواہشوں کو لاج کی اوڑھنی تلے چھپائے رکھے ہے۔

اور رنڈی شش نے پوچھا۔

رنڈی میں لاج نہیں ہوتی۔ وہ سہتی نہیں صرف کہتی ہی کہتی ہے۔ پریم لگن بیٹے نہیں ہے صرف جتاوے ہی جتاوے ہے۔ چلے نہیں پریوں نظر آوے ہے جیسے بھڑک کر جل رہی ہو۔ اندر سے کالی ہووے ہے پر باہر بھیڑ لگاوے ہے۔ لگائے رکھے ہے۔ سچ کہتی ہوشش نے ہنکارا بھرا۔

جب مرد گھر والی کی ایک رنگی سے اکتا جاتا ہے تو وہ حویلی کا رخ کرتا ہے۔ نانکھ نے بات جاری کی۔ اسے گھر والی کی کٹوری اوندی نظر آتی ہے۔ اس لئے وہ بھری ہوئی اچھلتی ہوئی بلوری پیالی کی طرف آتا ہے۔ مہاراج میں تو صرف اچھلتی پیالیوں کو جانتی ہوں۔ میں گھر کی عورت کو کیا جانوں۔ نانکھ خاموش ہو گئی۔

شش سوچ میں پڑ گیا۔ کون سی چال چلوں کہ راج نانکھ بولنے پر مائل ہو۔ ادھر راج نانکھ سوچ میں پڑی تھی کہ یہ شخص کون ہے۔ کیوں بھید لے رہا ہے۔ کس کے لئے بھید لے رہا ہے۔ وہ اور بھی محتاط ہوئی جا رہی تھی۔

دیکھ دیوی۔ شش بولا۔ اندر سے تو استری ہی ہے نا۔ نانکھ تو ایک بہروپ ہے جو تو نے دھار رکھا ہے تاکہ کاروبار چلتا رہے۔ یہ سچ ہے مہاراج کہ نانکھ میں بھی عورت ہوتی ہے جسے وہ اپنی من کے پلو میں یوں باندھ رکھتی ہے جیسے گاؤں والی اپنی چنی کی کنی میں پیسے باندھ رکھتی ہے۔ لیکن مہاراج یہ بات تو گھر والی پر بھی ایسے ہی بیٹھتی ہے جیسے نانکھ پر۔ میں سمجھا نہیں دیوی شش نے کہا۔

مہاراج نانکھ بولی۔ جس طرح طوائف کے من میں عورت کی پوٹلی بندھی ہوتی ہے اسی طرح عورت کے دل میں طوائف کی پوٹلی بندھی رہتی ہے۔

وہ کیسے دیوی شش نے پوچھا۔

نانکھ نے کہا مہاراج سیدھی بات ہے۔ انسان اس کی قدر نہیں کرتا جو اسے حاصل ہو اس کے سپنے دیکھتا ہے نانکھ کو گھر گھر سستی حاصل نہیں اس لئے وہ گھر کے سپنے دیکھتی ہے۔ گھر گھر سستی کو طوائف کی کشش حاصل نہیں اس لئے وہ طوائف کے سپنے دیکھتی ہے۔ دیوی۔ شش نے کہا۔ تیری حویلی میں رنگ رنگ کے پرش آتے ہیں تو ان کو دیکھتی ہے۔ ان کی اکشاؤں کو جانتی ہے وہ گھر میں پوری نہیں ہو پاتیں جنہیں پورا کرنے کے لئے وہ یہاں آتے ہیں اور یوں تجھے پتہ چل جاتا ہے کہ گھر گھر سستی میں کیا ہے کیا نہیں۔ تو آنے والوں کے روپ سے گھر کی عورت کے رنگ ڈھنگ کو خوب جانتی ہے۔

راج نانکہ سوچ میں پڑ گئی۔ اور دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔ بولی مہاراج ایک بات پوچھوں۔

ہاں ہاں پوچھو۔ ایک کیا دس پوچھو۔ شش مسکرایا۔

یہ بتاؤ مہاراج کہ آپ یہاں خود آئے ہیں کیا؟

میں نہیں سمجھا۔ شش نے سوچنے کے لئے وقت حاصل کرنے کے لئے کہا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنا بھید رکھے رہے یا

کھول دے۔

نانکہ مسکرائی۔ بولی مہاراج جو یہاں خود آتا ہے وہ ایسی باتیں نہیں پوچھتا جیسی آپ پوچھ رہے ہیں۔

اب بات چھپانا بے کار تھا اس لیے شش نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نانکہ سے ساری بات کہہ دے گا۔

تو نے میرا بھید کیسے جان لیا دیوی شش ہنس کر بولا۔

نانکہ کہنے لگی مہاراج اپسرا حویلی تو بھید حویلی ہوتی ہے۔ یہاں ہر کوئی اپنا بھید رکھنے کے لئے پورا زور لگاتا ہے۔ نانکہ اپنا بھید

چھپاتی ہے۔ گا ہک اپنا بھید چھپاتا ہے اور بھید کی یہ عادت ہے مہاراج کہ جتنا چھپاؤ اتنا کھل کھل جاتا ہے۔ پھوٹ پھوٹ نکلتا ہے تو

مہاراج اس حویلی میں سارے ہی پردوں سے ڈھکے ہوتے ہیں۔ پرنتو سارے ہی ننگے ہوتے ہیں۔

کتنی سیانی ہے تو دیوی شش نے کہا۔

وہ تو مہاراج میں پہلے ہی جان گئی تھی کہ آپ یہاں خود نہیں آئے۔ پر بھجن والے کا پتہ ابھی تک نہیں چلا۔ چلے تو معلوم ہو کہ کس

خیال سے بھیجا ہے۔ صرف جاننے کے لئے کہ جان کر جانی بات کو برتنے کے لئے۔

یہ سن کر شش نے نانکہ کو ساری بات کہہ سنائی۔ جسے سکر نانکہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ بولی مہاراج پہلے ہی بتا دیتے تو میں بات

ٹالن میں نہ لگی رہتی۔

شش ہنسنے لگا۔

نانکہ بولی۔ مہاراج فریاد نہ سچی ہے۔ عورت نے نسائیت کو تیاگ دیا ہے۔

تمہیں کیسے پتہ ہے جو اتنے بھروسے سے کہہ رہی ہے۔ شش نے پوچھا۔

مہاراج مجھے پتہ ہے۔ یہ سنی سنائی نہیں جیتی کہہ رہی ہوں۔

وہ کیسے؟ شش نے پوچھا۔

نانکھ نے جواب دیا مہاراج حویلی ویران ہوتی جا رہی ہے۔ حویلی میں اب وہ بھیڑ نہیں رہی۔ بہت کم لوگ آتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے وہ کچھ جس کے لئے وہ یہاں آتے تھے۔ اب انہیں گھروں میں مل جاتا ہے۔

کیا عورت میں رنڈی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ شش نے پوچھا۔

مہاراج۔ نانکھ نے جواب دیا۔ گھر گھر سستی نے لاج کی اوڑھنی کو سر سے اتار دیا ہے۔ اس نے نسائیت کی خوشبو کو تیاگ کر رنگ اپنالیا ہے۔ بھڑکیلا رنگ۔ پہلے وہ مرد کے ہاتھ کا کھلونا بننے میں خوشی محسوس کرتی تھی۔ اب اس نے مرد کو اپنے ہاتھ کا کھلونا بنانے کا فن جان لیا ہے۔ ہاں مہاراج۔ عورت میں طوائف کا رنگ ابھرتا آ رہا ہے۔ اسی وجہ سے حویلی ویران ہوتی جا رہی ہے۔

اچھا تو اب ہوگا کیا۔ شش گویا خود سے بڑے فکر مندانہ انداز میں بولا۔

اگر استری نہ رہی تو مرد مرد نہ رہے گا۔

ہاں مہاراج۔ مرد مرد نہیں رہا۔ نانکھ نے جواب دیا۔ دونوں کے لباس ایک جیسے ہو گئے ہیں۔ چال ڈھال ایک جیسی ہو گئی ہے۔ رنگ روپ ایک جیسا۔ کوئی فرق نہیں رہا مہاراج۔

کیا انہیں الگ الگ ہونا چاہیے اس بارے میں تو کیا کہتی ہے۔ شش نے پوچھا۔

ضرور الگ ہونا چاہیے مہاراج۔ ایک سی چیزیں ایک دو بے کولبھاتی نہیں۔ اک دو بے کوچھیڑتی نہیں۔ کھینچتی نہیں۔ جو مرد عورت میں چھیڑ نہ رہے لہذا وہ نہ رہے تو پھر رہا کیا۔ مہاراج اگر مرد عورت اک دو بے کے الٹ ہوں تو ایک دو بے کو کھینچیں گے۔ جو ٹھنڈی اور گرم تاریں ملیں تو شعلہ نکلتا ہے۔ ایک سی تاریں ہوں تو کچھ بھی نہ ہو۔

شش گھبرا گیا اور اضطراب میں بولا تو پھر ہوگا کیا۔

کچھ نہیں ہوگا مہاراج۔

یہ تم کیا کہہ رہی ہو دیوی شش بولا۔

سچ کہہ رہی ہوں مہاراج۔

جو استری بدل گئی تو۔

نہیں بدلے گی۔ نانکھ مسکرائی۔

تو خود ہی تو کہہ رہی ہے دیوی کہ وہ بدل رہی ہے۔

مہاراج جب وہ نمک کھا کھا کراکتا جاتی ہے تو پھر میٹھا کھانے لگتی ہے صرف منہ کا سواد بدلنے کے لئے چار دن میٹھا کھا کر منہ پھر جائے گا اور وہ پھر سے لون کو اپنالے گی۔

کیا یہ سچ ہے؟ شش نے چونک کر پوچھا۔

راج نانکہ مسکرائی۔ بولی مہاراج بیٹے سے میں کئی بار عورت اپنی ڈگر سے ہٹ کے چلی تھی۔ پر تو صرف اس لئے کہ پھر سے اپنی ڈگر کو اپنالے۔ وہ اپنا آپ صرف اس لئے کھودیتی ہے کہ اسے پھر سے پالے۔ پھر سے خود کو جانے۔ تو پھر میں جا کر دیوتا مہاراج سے کیا کہوں۔

انہیں داسی کا پر نام دینا مہاراج۔ ان سے کہنا چنانہ کریں۔ جو آج عورت میں ابال آیا ہے اس کی چنانہ کریں۔ ابال کا کام آنا اور آ کر چلے جانا ہوتا ہے۔ جھکڑ کا کام چلتے رہنا نہیں بلکہ چل کر تھم جانا ہوتا ہے۔ وہ اس لئے آتا ہے کہ لوگ خاموشی اور سکون کی قدر جانیں۔

لیکن دیوی یہ جھکڑ تو پتہ نہیں کب تک چلے۔

نانکہ بولی۔ دھیرج دھرو مہاراج اسے چلنے دو۔ روکو نہیں۔ جو روکو گے تو دب جائے گا۔ دلوں میں بیٹھ جائے گا۔ پھر اسے نکالنا مشکل ہو جائے گا۔

لیکن دیوی ہم فریادن کو کیا جواب دیں۔ شش نے پوچھا۔

مہاراج فریادن کو ہماری حویلی میں بھیج دو۔

شش گھبرا گیا۔ بولا دیوی کیا لاج اور متنا کو یہاں بھیج دیں۔ لاج متنا کا حویلی سے کیا ناطہ۔ کیا رنڈی لاج کو اپنالے گی۔

مہاراج نانکہ مسکرائی۔ بولی بے شک لاج میں بڑی پورتا ہے۔ پر یہ نہ بھولو مہاراج کہ اصل میں لاج بھی اک سنگھار ہے۔

گالوں پر لالی چاہے ڈبیہ سے نکال کر لگا لو چاہے شرما کر لگا لو۔

شرما کر لالی کیسے لگاؤ گی دیوی۔ شش نے ٹوکا۔

مہاراج شرمانے کی لالی خون کی سرخی ہے۔ لاج خون کو رگوں میں دوڑا کر گالوں میں لے جاتا ہے۔ چاہے کیسے بھی لے جاتا

ہے مہاراج پر یہ سچ ہے کہ لاج اک سنگھار ہے۔ مطلب ہے دو بے کے دھیان کو اپنی طرف کرنا دو بے کو لبھانا۔ مائل کرنا۔

ہوں۔ شش مسکرایا۔

مہاراج مرد نرنج لچے سے جلد اکتا جائے گا۔ پھر وہ طوائف کی طرف آئے گا۔ طوائف کی لاج اسے بھر مالے گی۔ پھر گھر گھر ستن دیکھے گی کہ گھر والا لاج کے لئے حویلی میں جاتا ہے تو وہ اسے گھر رکھنے کے لئے پھر سے لاج کو اپنا لے گی اور رنڈی پھر سے نرنج لچے ہو جائے گی۔ یوں چکر پورا ہو جائے گا۔ اس لئے مہاراج۔ فریادن کو حویلی بھیج دو۔



آغا اور اسمارا کی

اگر آپ سیاحت سے دلچسپی رکھتے ہیں تو آپ سفید آباد ضرور گئے ہوں گے۔ چک نارو سے جو براچی لائن شمیر کو جاتی ہے سفید آبادی اسی لائن پر واقع ہے پہلے سفید؟ آبادی کو چٹی ڈھیری کہا کرتے تھے۔ مدفون شہروں کو ہمارے ہاں ڈھیری ہی کہتے ہیں۔ اب کھدائی کے بعد پتہ چلا ہے کہ تقریباً ایک ہزار سال پہلے وہاں رائگاں قوم آباد تھی ان دنوں سفید آباد کا نام امرت پورن تھا۔

سفید آباد کی اہمیت صرف آثار قدیمہ کی وجہ سے ہی نہیں ویسے بھی یہ علاقہ بے حد انوکھا اور خوبصورت ہے سفید آباد سے بیس میل دور چٹا پہاڑ شروع ہو جاتا ہے۔ ایک دم دودھ سی چٹی سفید زمین ابھر آتی ہے ایسے محسوس ہونے لگتا ہے۔ جیسے آپ کثیف زمین کو چھوڑ کر کسی منور سیارے پر آ پہنچے ہوں۔

اگر آپ کبھی سفید آباد گئے ہیں تو یقیناً آپ نے آغا کو دیکھا ہوگا۔ جب گاڑی سٹیشن میں داخل ہوتی ہے تو وہ پلیٹ فارم پر لائین کے نیچے پتھر کے بیچ پر بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ جب گاڑی رک جاتی ہے تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے بڑے وقار سے آنے والے ٹورسٹوں کا جائزہ لیتا ہے۔

وہ ایک درمیانے قد کا پروقار بوڑھا ہے اس کی عمر ۶۵ سال سے کچھ زیادہ ہوگی۔ بڑا دل ڈریسڈ آدمی ہے اگرچہ اس کا سوٹ پرانے فیشن کا ہوتا ہے لیکن ایسے لگتا ہے جیسے ابھی ابھی ڈرائی کلینر سے آیا ہو۔ اس کا کالر سفید اور سنٹ ہوتا ہے۔ ٹکٹا کی جگہ ایک صاف ستھری بولگی ہوتی ہے اور ہاتھ میں چھتری ہوتی ہے۔

اس کے چہرے پر سنجیدگی، امید اور بشاشت نمایاں ہوتے ہیں بشرطیکہ آپ اس سے مخاطب ہوں اگر وہ اکیلا بیٹھا ہو تو چہرے پر چھوٹی چھوٹی جھریاں یوں ریختی ہیں جیسے دکھ کے اتھاہ سمندر میں تنکے جھول رہے ہوں یا ریت کے گھروندے میں چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔

آنے والے سیاحوں کا جائزہ لے کر وہ نوجوان نوار کی طرف بڑھتا ہے گڈ مارنگ سرکٹنا اچھا دن ہے آج آپ امرت پورن دیکھنے آئے ہیں نا۔ آئیے آئیے میں آپ کو لے چلتا ہوں میں امرت پورن کی اینٹ اینٹ سے واقف ہوں۔ ملی مندر پارا کھوہ رائگانا مانگ سب جگہوں سے واقف ہوں۔ آئیے آئیے میں آپ کو سب کچھ دکھا دوں گا۔ یس یس آئی ایم گا ہیڈ بٹ نو نو بخشش۔

تھنگ۔

۱۹۷۳ء میں جب میں پہلی مرتبہ سفید آباد گیا تھا تو اسے مل کر حیران ہوا تھا خصوصاً جب اس نے کہا میں یس آئی ایم گائیڈ بٹ نو نو فی نوٹشیش تھنگ۔ اس کی اس بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ آپ سے کیا پروردہ میں اس پر شک کرنے لگا تھا۔ دور حاضرہ میں ہمیں عادت پڑ گئی ہے کہ ہر بات میں مقصد اور مفاد تلاش کریں اور مقصد اور مفاد دکھائی نہ دے تو بے نام شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں۔ یہ کیسا گائیڈ ہے میں نے سوچا جو نہ تو فیس لیتا ہے اور نہ بخشیش۔

امرت پورن سفید آباد سے دو میل کے فاصلے پر ہے ہم دونوں تانگے پر سوار ہو گئے۔

میرے لیے یہ ایک عجیب و غریب سفر تھا۔ چاروں طرف دودھیا پہاڑ پھیلا ہوا تھا چٹا سفید براق سا پہاڑ۔ اگرچہ سفید پہاڑ چاک کا پہاڑ نہیں پتھر کا ہے لیکن یہ پتھر سخت نہیں بلکہ ملائم ہے۔ دیکھنے میں پتھر لگتا ہی نہیں۔ نہ تو اس میں تہیں ہیں نہ ریشے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ سفید پتھر سورج کی شعاعوں کو ریفلکٹ نہیں کرتا بلکہ انہیں جذب کر لیتا ہے اور جذب کرنے کے باوجود گرم نہیں ہوتا۔ میں ان خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ آغا بولا۔ اس سفید پتھر کی نوعیت کے متعلق میری معلومات مکمل نہیں ہاں اسماء جانتی ہے اسماء نے پوری تحقیق کی ہے جب ہم سفید آباد آ کر آباد ہوئے تھے تو سب سے پہلے اسماء نے اس سفید پتھر پر تحقیق کی تھی کہ یہ دھوپ میں تپتا کیوں نہیں۔ اتنا ملائم کیوں ہے اس میں لیٹ کر کیوں نہیں ہیں اور پھر یہاں کاشت کیوں نہیں ہو سکتی۔ اسماء نے ان سب باتوں پر تحقیق کی تھی وہ آپ کو یہ سب باتیں بتا سکتی ہے۔

پھر دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ میں اسماء سے متعارف نہیں ہوں وہ ہنس پڑا۔ بولا اسماء میری بیٹی ہے وہ ایم ایس سی ہے میں اور اسماء اکٹھے رہتے ہیں اس کی والدہ فوت ہو چکی ہے نا۔ اس لیے میں نے دوسری شادی نہیں کی۔ کیسے کرتا؟ کر لیتا تو اسماء کی تربیت کون کرتا؟ وہ بڑی پیاری بچی ہے آپ اسے مل کر بے حد خوش ہوں گے آغانے میری طرف ملتی نظروں سے دیکھا۔ اس وقت ہم موٹر پر پہنچ چکے تھے۔ موٹر مڑتے ہی میری توجہ امرت پورن کی طرف منعطف ہو گئی۔ ہمارے سامنے پہاڑ کی ایک چوٹی پر سفید پتھر کے گھروندے سے بنے ہوئے نظر آ رہے تھے جن میں کالی دھاریوں کے بارڈر دوڑ رہے تھے۔

ارے! میں نے پوچھا یہی امرت پورن ہے کیا؟

آغانے چھڑی اٹھائی اور اشارہ کرتے ہوئے بولا یہ چوٹی کے اوپر جو عمارتیں نظر آ رہی ہیں یہ امرت پورن کے محلات ہیں اس سے پرے نچان میں امرت پورن کا شہر ہے۔ شہر تو سب ٹوٹ پھوٹ چکا ہے لیکن محلات ابھی تک اچھی حالت میں ہیں۔ شہر کے پاس

پارا کھوہ ہے یہ غاروں کا ایک سلسلہ ہے۔

سب سے بڑا غار را نگا نا نگ ہے جس میں را نگا قوم کا اکٹھ ہوا کرتا تھا اس کے ایک کونے میں بلی مندر ہے۔ بلی مندر دراصل ایک قربان گاہ ہے جہاں دیوتاؤں کے حضور قربانی پیش کی جاتی تھی لیکن میں ساری تفصیلات سے واقف نہیں ہوں۔ ہاں اسماء نے تحقیق کر کے امرت پورن پر ایک کتاب لکھی ہے لیکن اسماء ابھی اسے چھپوانے کے لیے تیار نہیں۔ وہ ہنسنے لگا کہتی ہے یہ تحقیق ابھی خام ہے جب تک امرت رس کا کھوج نہ لگے کتاب مکمل نہیں ہو سکتی۔ پھر وہ ہنسنے لگا۔ اسماء میں تکمیل کا جذبہ بہت شدید ہے وہ پرفیکشن کی دیوانی ہے۔ امرت رس ایک چشمہ تھا جو بوند بوند گرتا تھا۔ جسے را نگا فریلمیٹی کا چشمہ سمجھتے تھے۔ آج کل اسماء امرت رس کا کھوج لگا رہی ہے۔ ادھر سے کام سے اسے قطعی دلچسپی نہیں لیکن جب آپ اسماء کو دیکھیں گے تو آپ حیران رہ جائیں گے اس کے چہرے سے پتہ نہیں چلتا کہ وہ اس قدر عالمانہ خیالات کی مالک ہے۔

آپ جانتے ہیں علم کا خط عورت کے چہرے پر ایک عجیب سی کرسنگی پیدا کر دیتا ہے جیسے ہارڈ بوالڈ ایگ ہو لیکن نہیں اسماء کے چہرے پر بڑی معصومیت ہے۔ معصومیت اور کرسنگی دیکھیں تو ایسے لگتا ہے جیسے وہ مشکل سے دس جماعتیں پاس ہو۔ کتنی حیران کن بات ہے لیکن ہاتھ نکلن کو آری کیا ہے۔ آپ خود ہی دیکھ لیں گے آج ہی۔

عین اس وقت تانگے والے نے پوچھا۔ آپ پہلے کھوہ کی طرف جائیں گے یا محل دیکھیں گے پیشتر اس کے کہ میں جواب دیتا آغا بولا پہلے کھوہ کی طرف چلو۔ تانگہ بان نے دائیں طرف تانگہ موڑ دیا۔ آپ ہمیشہ سے یہیں مقیم ہیں کیا۔ میں نے آغا سے پوچھا۔

نہیں نہیں وہ بولا۔ میرا نام آغا ثناء اللہ ہے میں نے ساری زندگی گورنمنٹ سروس میں گزاری ہے پھر ریٹائرمنٹ کے دو سال بعد اتفاق سے اسماء اور میں سفید پور آئے اسماء کو یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ میں نے یہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک چھوٹا سا مکان بنوا لیا ہے بڑا مکان بنوانے کی کیا ضرورت تھی۔ بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ اسماء کی شادی ہو جائے گی تو میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ بڑا مکان کیا کرنا ہے۔

آپ نے اتنا پڑھا لکھا کراپنی بیٹی کو گھر بٹھا رکھا ہے آغا صاحب۔ میں نے ویسے ہی کچھ کہنے کے خیال سے کہا۔ نہیں نہیں وہ بولا بیٹی سے ملازمت کرانے کا مجھے کوئی حق نہیں اور پھر شاید اس کا ہونے والا خاوند اسے پسند نہ کرے۔ ہاں اگر شادی کے بعد اس کا ہونے والا خاوند چاہے تو بیشک نوکری کرے۔ آپ کسی بیٹی کے باپ نہیں ہیں نا؟ وہ ہنسنے لگا۔

ابھی تو نہیں۔ میں نے جواب دیا۔

آپ باپ کی ذمہ داری کو نہیں جانتے صاحب! میں نے اپنی بیٹی کو آئیڈیل بیوی بنانے کی کوشش کی ہے اس کا ذہن مغربی ہے اور روح مشرقی۔ سینا پرونا سلائی کڑھائی اور خانہ داری میں اسماء کو بڑی دسترس حاصل ہے صرف پاکستانی ہی نہیں اسے کانٹی نیٹل کھانے پکانے بھی آتے ہیں اور یہ سب ٹریننگ میں نے اسے بڑی کاوش سے دی ہے۔ اس کا ہونے والا خاوند سکھ بھری زندگی بسر کرنے گا۔

کیا آج کا خاوند سکھ بھری زندگی چاہتا ہے۔ میرے جی میں آیا کہ آغا سے پوچھوں لیکن اس وقت آغا اسماء کے دھیان میں کھویا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے ویرانے میں فکر بھری جھریاں یوں سمٹ کر پھیل رہی تھیں جیسے ریت کے گھر وندے پر چپوئے حرکت میں ہوں اس کے چہرے کو دیکھنے کے بعد مجھے پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔

کھوہ کو دیکھنے میں ہمیں پورے دو گھنٹے لگ گئے اس دوران وہ مجھ سے امرت پورن کی باتیں کرتا رہا لیکن ہر چیز کی تفصیل سمجھاتے ہوئے بات اسماء کی طرف مڑ جاتی اور وہ اسماء کے کوائف بیان کرنے لگتا۔

ان دو گھنٹوں میں مجھے امرت پورن کی بجائے اسماء کے کوائف سے زیادہ واقفیت ہو چکی تھی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ امرت پور کا نہیں اسماء کا گائیڈ ہو۔

اس کی باتیں سن کر میرے دل میں اسماء کے لیے عجیب سی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ کیسے نہ ہوتی آغا نے اسماء کے متعلق تفصیلات بیان کر کے میری آنکھوں کے سامنے اسماء کی تصویر کھڑی کر دی تھی۔ وہ کیسے اٹھتی ہے کیسے بیٹھتی ہے کیسے مسکراتی ہے کیسے سو جتی ہے کیسے گفتگو کرتی ہے اس کی آنکھوں میں کتنی معصومیت ہے ٹھوڑی کتنی کتابی ہے۔

پھر جب ہم کھوہ سے واپس آئے اور ہمارا تانگہ محل کی طرف مڑنے لگا تو میں نے تانگے والے کو منع کر دیا کہ محل کی طرف نہ مڑے محل پھر سہی تو آغا کی آنکھوں میں ایک چمک لہرائی بالکل ٹھیک وہ بولا۔ آپ ہوٹل میں نہ ٹھہریں یہاں صرف ایک ہوٹل ہے امرت پورن ہوٹل لیکن وہاں نہ امرت ہے نہ پورن ہے وہ تو سیاحوں کی کھال تک اتار لیتے ہیں۔ مہنگ فروشی کی انتہا ہے۔ چائے کا پیالہ ایک روپے میں۔ ذرا اندازہ لگائیے۔ آپ ہمارے ہاں ٹھہریے ہم نے گھر کا ایک کمرہ مہمان کے لیے وقف کر رکھا ہے چھوٹا سہی مگر آرام دہ ہے اور پھر اسماء خود سروس کرے گی۔ اس نے مہمان نوازی کی خصوصی تربیت حاصل کر رکھی ہے۔ دفعتاً وہ رکا۔ اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور گھبرا کر بولا نونو نونو ہم پیئنگ گیٹ نہیں رکھتے، گیٹ نہیں رکھتے، نو چارج، نو پے منٹ، تنہنگ پیلز۔

آغا کے چہرے پر بے بسی، لجاجت اور فکر مندی دیکھ کر میرا دل ڈوب گیا۔ اس وقت مجھے یہ کہنے کی ہمت نہ پڑی کہ مجھے آج ہی واپس جانا ہے۔

جب ہم سٹیشن کے قریب پہنچے تو میں نے ہمت کر کے کہہ دیا کہ مجھے آج ہی واپس جانا ہے۔ اس پر آغا کے چہرے کی ساری جھریاں اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کے کونوں پر اکٹھی ہو گئیں اور اس کا چہرہ یوں نظر آنے لگا جیسے دکھ کا اتھاہ سمندر موجیں مار رہا ہو۔ یہ دیکھ کر میں نے اسے تسلی دی۔ میں نے کہا میں جلدی واپس آؤں گا بہت جلد واپس آؤں گا۔ بہت جلد اس پر اس کے چہرے پر پھر امید کی کرن طلوع ہو گئی۔

جب میں گاڑی میں سوار ہو رہا تھا تو آغا مجھ سے گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ جلد آئیے گا۔ اسماء اور میں آپ کا انتظار کریں گے۔

جب گاڑی چلنے لگی تو پیٹہ نہیں کیوں میرے منہ سے نکلا آغا صاحب اسماء کو گائیڈ بنا کر اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھتے۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر اس کی گردن لٹک گئی غالباً وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔

دور تک گاڑی کے دروازے میں کھڑا میں اسے دیکھتا رہا وہ واپس جا رہا تھا گردن یوں لٹکی ہوئی تھی جیسے ٹوٹ گئی ہو واپس جاتے ہوئے اس کی چال میں وقار نہیں تھا۔ کمر جھکی ہوئی تھی۔ ٹانگیں جیسے گھسنتی جا رہی ہوں اور چھڑی جیسے گر جانے سے بچنے کا واحد سہارا ہو۔

شہر واپس آ کر میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور امرت پورن کے اس بوڑھے پینشر کو بالکل بھول گیا پھر ایک دن جمیل نے بات چھیڑی تو چٹا پہاڑ میرے سامنے آکھڑا ہوا اور پہاڑ کے سامنے آغا یوں کھڑا ہو گیا جیسے سینما کے پوسٹروں پر ہیرو ایستادہ ہوتے ہیں اس کے شانے کے پیچھے سے اسماء جھانک رہی تھی۔

تمہارا امرت پور کا ٹرپ کیسا رہا۔ جمیل نے پوچھا۔

میں نے کہا امرت پورن تو میں نے غور سے دیکھا ہی نہیں

کیوں جمیل نے پوچھا۔

وہاں ایک بوڑھا پینشر آغا ل گیا تھا وہ اتنا عظیم کردار تھا کہ اس نے امرت پورن کو ڈھانپ لیا۔

اچھا جمیل ہنسا۔ ہاں! میں نے جواب دیا وہ بڑھا آغا اور اس کی بیٹی اسماء دونوں ہی۔

اسماء جمیل نے دہرایا۔ کہیں وہ آغا ثناء اللہ تو نہیں۔

کچھ ایسا ہی نام بتایا تھا اس نے۔ میں نے جواب دیا۔

جمیل بولا میں اسے جانتا ہوں وہ ابا جان کا کولیگ تھا۔ ہمارے گھر کے ساتھ ہی رہتا تھا۔

اچھا تو تم اسماء کو بھی جانتے ہو۔

اسماء سے تو میری شادی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ جمیل نے کہا۔

ارے.....! میں چلایا۔ مجھے پوری بات بتاؤ یار۔

اس پر جمیل نے سگریٹ سلگایا کرسی پر ٹیک لگائی۔ دو ایک کش لیے اور کہنے لگا۔

آغا کی کہانی بڑی مختصر ہے۔ یہ ایک المیہ ہے ان لوگوں کا المیہ جو اپنی بیٹیوں کی تربیت قدروں کے مطابق کرتے ہیں اپنے نقطہ

نظر سے انہیں مثالی بیویاں بنانے کی کوشش کرتے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ ہونے والے خاوند کیا چاہتے ہیں اور۔

فلسفہ نہ بگھا رو میں نے اس کی بات کاٹی۔

وہ ہنس پڑا کہنے لگا آغا ایک بلند کردار آدمی تھا اسے اپنی بیوی سے محبت تھی لیکن وہ ایک حادثے میں فوت ہو گئی اس کی صرف

ایک ہی بیٹی ہے..... اسماء کو ایک آئیڈیل بیوی بنائے۔

اور وہ کامیاب ہو گیا کیا؟ میں نے پوچھا۔

بڑی حد تک جمیل نے کہا لڑکی کو ایم ایس سی کرایا گھر پر آرٹس کی تعلیم دی۔ موسیقی، مصوری، ابتدائی تعلیم پھر خانہ داری، سینا پرونا

اس نے اسماء کو سب کچھ سکھایا۔ لیکن جمیل نے ایک لمبی آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔

لیکن کیا؟ میں نے پوچھا۔

محلے میں اور جوان لڑکیاں بھی تھیں لیکن آغا انہیں پسند نہیں کرتا تھا اس لیے کہ ان میں دکھاوا تھا۔ شوخی تھی۔ فیشن تھا سب طمع ہی طمع

وہ کہا کرتا تھا۔ جمیل ہنسنے لگا۔ سارے محلے میں اسماء کے سکھڑ پنے اور کردار کی دھوم تھی۔ محلے والے اسماء کی مثال دیا کرتے تھے۔

ہوں یہ بات ہے میں نے کہا۔

لیکن جمیل نے سلسلہ کلام جاری کیا اسماء کے لیے کوئی پیغام نہ آیا اس کے برعکس محلے کی دوسری لڑکیاں باری باری سب لگ گئیں

سب کی شادیاں ہو گئیں صرف اسماء رہ گئی۔

لیکن کیوں! میں نے پوچھا۔

پتہ نہیں کیوں؟ بڑے سب اسماء کے حق میں تھے اور نو جوان اگرچہ اس کے معترف تھے لیکن اس سے شادی کرنے کے لیے تیار نہ تھے اسلم نے تو صاف انکار کر دیا تھا۔ اس نے اپنی امی سے کہا تھا کہ وہ تو نمازیں پڑھتی ہے پھر یہ بات سارے محلے میں مشہور ہو گئی تھی حتیٰ کہ آغا نے اسماء کو نماز پڑھنے سے منع کر دیا تھا۔ جمیل خاموش ہو گیا اور سگریٹ کے کش لینے لگا۔

لیکن تم تو کہتے تھے میں نے پوچھا کہ تمہاری شادی اسماء سے ہوتے ہوتے رہ گئی۔

ہاں وہ بولا۔ امی۔ ابا کی بڑی خواہش تھی کہ میری شادی اسماء سے ہو جائے۔

اور تمہاری اپنی خواہش نہ تھی کیا؟ میں نے پوچھا۔

میری خواہش بھی تھی اس میں بڑے گن تھے اس میں مٹھاس تھی۔

ساتھی بننے کی صلاحیت تھی۔ خدمت کا جذبہ تھا۔ بڑی معصومیت تھی اس میں ہر وہ گن موجود تھا جو جیون ساتھی میں ہونا چاہیے۔

پھر بات ٹوٹ کیوں گئی؟ میں نے پوچھا۔

انہی دنوں مجھے شہناز مل گئی اس میں اتنی بھڑک تھی کہ میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور میں شہناز کا ہو کر رہ گیا۔ جمیل خاموش ہو گیا۔

کافی دیر تک خاموشی سے سگریٹ کے کش لگا رہا۔ پھر بولا دراصل اسماء ایک دیا تھی جو مدہم لو سے جلتا تھا۔ اس میں بھڑک نہیں تھی اور مدہم بھڑک کے دلدادہ ہیں وہ پھر خاموش ہو گیا۔ پھر آپ ہی آپ گلگنانے لگا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو کہ کاش میں شہناز سے نہ ملتا۔ اسی سال مجھے پھر امرت پورن جانے کا اتفاق ہوا جب گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو میں نے دیکھا کہ آغا اپنی مخصوص بچ پر موجود نہ تھا اس کی جگہ پیوں کا ایک جوڑا بیٹھا تھا۔

خیر میں گاڑی سے نیچے اتر جب میں پلیٹ فارم کے دروازے کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پیوں کا جوڑا میرے سامنے کھڑا ہے۔ پی نے سر پر ہیٹ پہنا ہوا تھا ہین کے بال کھلے تھے اور جسم پر ایک لمبا چٹا تھا۔

پی نے ایک چھپا ہوا کارڈ میرے سامنے کر دیا اس پر لکھا تھا مسٹر آرتھر جیک اور مس ”آئی۔ وی“ امرت پورن کے مستند گائیڈ ہیں۔ کارڈ پڑھ کر پی کو واپس کرتے ہوئے میں نے پہلی بار غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ارے آغا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ساتھ ہی میری نگاہ اسماء پر پڑھی جو اس وقت کارٹون لگ رہی تھی۔ یہ آپ کی بیٹی اسماء اور آپ آغا ہیں نا۔

نہیں آغا نے جواب دیا۔ میں آغا نہیں ہوں میں آرتھر جیک ہوں اور یہ میری بیٹی مس آئی وی ہے ہم کنورٹ ہو گئے ہیں سر۔

یہ کہتے ہوئے آغا کی آنکھیں بھر آئیں اور آنسو ڈھلک کر اس کے چہرے کی جھریوں میں اٹک گئے۔



ہانڈ ہاؤس

ڈاکٹر نے پوچھا مونا ڈر تو نہیں گئی۔

میں جواب دینے ہی والی تھی کہ ڈیڈ بولے نہیں ڈرنے کی کیا بات ہے۔

یہ سن کر میں تو چپ ہو گئی میں کیا بولتی بھلا۔

ڈیڈی کو کیا پتہ کہ یہ گھر ہانڈ ہے۔ کسی کو بھی تو نہیں پتہ۔ کوئی بیک یار ڈ میں گیا ہو تو پتہ چلے نا۔ کوئی بھی تو نہیں جاتا ادھر۔ ممی جو کہتی ہے سرونٹ کو ارٹرز کی طرف نہیں جانا۔ اٹ از ناٹ ڈن۔

حسنے کے کوارٹر کے سامنے جو امرود کا بیڑ ہے اور پیڑ کے عین نیچے جو ٹوٹی ہوئی کرسی رکھی ہوئی ہے نا وہ اس پر بیٹھا رہتا ہے۔ میں نے تو کئی بار دیکھا ہے اسے۔ ایک بار نہیں کئی بار۔

اس نے سفید جوڑا پہن رکھا ہوتا ہے۔ چٹا سفید اس کا اتنا بڑا فیس ہے چوڑا لمبا۔ سارا کا سارا جھریوں سے بھرا ہوا۔ جھریاں ہی جھریاں نیچے سے اوپر تک تھیں لگی ہوئے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ان میں جنا ہو۔ پھیلی سمٹی رہتی ہیں نا۔ ریگتی ہیں جس طرح تالاب میں پتھر مار تو لہریں ریگتی ہیں۔ اور پھر اس کی اتنی لمبی داڑھی۔ اوپر سے چل کر نیچے چھاتی تک داڑھی ہی داڑھی چٹی سفید داڑھی۔

کرسی میں بیٹھے ہوئے وہ ادگھتا رہتا ہے۔ ذرا آہٹ ہو تو آنکھیں کھول دیتا ہے اور اس کی آنکھوں میں اتنی افیکشن ہے اتنی افیکشن ہے جتنی رضیہ کی آنکھوں میں چمکتی ہے جب وہ اپنی بیٹی نامو کی طرف دیکھتی ہے۔ رضیہ ہمارے پڑوسی کی میڈ سرونٹ ہے نا۔

میں تو اس سے کبھی نہ ڈری تھی۔ ایسے چٹے سفید روئی کے گالے بابے سے بھلا کون ڈرتا ہے۔ الٹا وہ مجھے دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ مدھم آواز میں پوچھتا ہے مس صاحبہ۔ صاحب نے بلایا ہے کیا۔ میں آؤں۔

جب میں نہ میں سر ہلا دیتی ہوں تو اس کی روشن آنکھیں سمجھ جاتی ہیں۔ اچھا نہیں بلایا۔

وہ تو وہاں صرف اس امید پر بیٹھا ہے کہ صاحب بلا لے۔ ایسے بابے سے بھلا کون ڈرے۔

مصیبت یوں آئی کہ میں حسنے سے پوچھ بیٹھی۔ نہ پوچھتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ نہ میں ڈرتی نہ مجھے بخار آتا۔ نہ ڈاکٹر کی کڑوی دوائیں کھانی پڑتیں۔ اور حسنے سے میں نے پوچھا بھی تو بائی دی وے تھا۔

میں نے کہا حسنے۔ تیرے کوارٹر کے سامنے امرود کے پیڑ کے نیچے جو بابا بیٹھا رہتا ہے وہ تیرا کچھ لگتا ہے کیا۔
 حسنے نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ کون سا بابا مس صاحبہ
 وہی جو سفید کپڑے پہنے ٹوٹی کرسی پر بیٹھا رہتا ہے۔
 نہیں مس صاحبہ اس نے جواب دیا۔ میں نے تو وہاں کبھی کسی بابے کو بیٹھے نہیں دیکھا۔
 یہ سن کر میری تو جان ہی نکل گئی۔

بس اس روز سے مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ اسی شام جب میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی تو میں نے سوچا ایک بار پھر دیکھوں تو۔ میرے
 باتھ روم کا روشندان بیک یارڈ میں کھلتا ہے۔ میں نے اٹھ کر روشندان سے جھانکا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ بابا کرسی پر جوں کا توں بیٹھا ہے۔
 اور اس کے پاس ہی جائے نماز بچھا ہوا ہے۔

یہ دیکھ کر میری تو ناگلیں کاٹنے لگیں اور پھر پھونک کر بخار چڑھ گیا۔

اس روز کے بعد میں کبھی بیک یارڈ میں نہیں گئی۔ نہ ہی میں نے کبھی باتھ روم کے روشندان سے جھانکا ہے۔ لیکن رات کو جب میں
 بیڈ پر لیٹی ہوں تو میرے دل میں خوف اٹھتا ہے کہ وہ ابھی باتھ روم کے روشندان سے جھانکے گا۔ اس پر میں لپک کر اٹھتی ہوں اور
 روشندان کا دروازہ بند کر دیتی ہوں۔

پھر آہستہ آہستہ میرے کمرے کی وہ دیوار جو بیک یارڈ کی طرف سے ہے کھل جاتی ہے جیسے بتاشہ ہو اور بیک یارڈ میرے
 سامنے آ جاتا ہے۔ پھر دفعتاً وہ مڑ کر میری طرف دیکھتا ہے۔ مس صاحبہ صاحب نے بلایا ہے کیا۔ میں آؤں۔
 میں چیخ کر اٹھی بیٹھی ہوں۔

آپ ہمارے گھر کو نہیں جانتے۔

ہمارا گھر اصولی گھر ہے۔ یہاں اصول چلتے ہیں کیا کہتے ہیں اسے ہاں صراط مستقیم۔ بس یہ سمجھ لو کہ ہمارا گھر صراط مستقیم ہے مذہب
 والا نہیں، سوشل والا صراط مستقیم۔ ہمارا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، ہنسنا رونا سب سوشل رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

یوں سمجھ لو کہ سوشل سڑک پر ہمارا گھر دو پہیوں پر چلتا ہے۔ ڈن۔ ناٹ ڈن جوفیشن میں ہے وہ ڈن ہے اس لیے کرو۔ فوراً کرو۔
 بھول چوک کی اجازت نہیں۔ جو ناٹ ڈن ہے۔ وہ نہیں ہوگا۔ نہیں ہو سکتا اس لیے مت کرو۔ وہ ٹیپو ہے۔ ٹیپو۔

اس بات میں می نے ہمیں بہت ٹرین کیا ہے۔ بات بات پر وہ ہمیں یاد دلاتی رہتی ہیں۔ بچومت کرو انٹرنٹ ڈن۔

ہم چار بھائی بہن ہیں۔ میں ہوں سنبھل ہے۔ ٹونی ہے اور بڑے بھائی جان آصف ہیں۔ بچپن سے ہی ہم ہر بات پر سوچتے ہیں کہ کہیں یہ ناٹ ڈن تو نہیں۔ ناٹ ڈن پر تو می ڈیڈ کو بھی ڈانٹ دیتی ہیں اور دیڈ نے کبھی برا نہیں مانا۔ بس پی جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ڈیڈ اپنے کسی دوست کو اپنے بیڈروم میں لے گئے تھے۔ تو بے ڈیڈی کو می سے جان چھڑانی مشکل ہو گئی تھی۔

دراصل می چاہتی ہے کہ وہ سوشل سیزھیوں پر چڑھتی جائے ذرا دم نہ لے۔ جیسی تو پچھلے پانچ سال میں ہم کہاں سے کہا آ پہنچے ہیں۔ ورنہ ہیں تو دونوں ہی گاؤں کے ڈیڈ بھی می بھی جیسی تو وہ پاسٹ کو بھول جانا چاہتی ہے۔ سب ریلیشنز کو چھوڑ دیا۔ نہ میل نہ ملاپ نہ آنا جانا نہ لینا دینا۔ جیسی تو ہمارے گھر نہ کبھی کوئی کزن آیا ہے نہ انکل نہ آنٹی۔

ہمارا گھر تو ٹک ٹک قسم کا گھر ہے آپ ہی آپ چلتا ہے جیسے گھڑی چلتی ہے۔ چیزیں اپنی اپنی جگہ یوں قائم رہتی ہیں جیسے کیل ٹھکے ہوئے ہوں۔ کیا مجال جو ادھر کی چیز ادھر ہو جائے۔ کیا مجال جو کوئی نوکر کو آواز دے کر بلائے۔ نوٹو گھنٹی بجاؤ۔ کیا مجال جو ہمارا کوئی فرنڈ ہمارے بیڈروم میں چلا جائے نو نیور۔

ساری غلطی ڈیڈ کی تھی۔ وہی اس بڈھے بابے کو انگلی لگا کر گھر میں لے آئے تھے۔

اس روز حسنا چھٹی پر تھا۔ ڈور بل جو ہوا تو خود میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ ویسے تو یہ ناٹ ڈن بات تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ڈیڈ اندر آ گئے۔

ارے یہ ڈیڈ نے بڈھے بابے کو کیوں انگلی لگا رکھا ہے۔ میں حیران مائی گاڈ واٹ از دس تھنگ۔ چٹی سفید واڑھی۔ کھڑکھڑ کرتی شلووار قمیض۔

میں سوچنے لگی۔ رشتے دار تو ہونے نہیں سکتا۔ سوشل وزیٹر بھی نہیں۔ پھر یہ ہے کون مائی گاڈ یہ کیا۔

ڈیڈ بڈھے کو بیڈروم کی طرف لے جا رہے تھے۔ نو نو نو بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ اٹ از ناٹ ڈن۔

لیکن اس روز سبھی ابا نارمل ہو رہے تھے۔

یہ اس روز کی بات ہے جس روز پی آئی اے کا طیارہ ہائی جیک ہوا تھا اور فضائی ڈاکو اسے پشاور کی جگہ کا بل لے گئے تھے۔

جب ہم نے خبر سنی تھی تو ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ می کا تو بہت برا حال تھا۔ ڈیڈی اسے حوصلہ دیتے لیکن می کی حالت غیر ہوتی جاتی۔

ویسے تو اس واقعہ پر ہر کسی کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ ہر کوئی ان غنڈوں کے خلاف دانت پیس رہا تھا۔ اس روز تو ہر کوئی ریڈیو

ٹیلیویشن پر خبروں کا انتظار کر رہا تھا۔ بھی یہ ایک قومی حادثہ تھا۔

لیکن ہم پر یہ خبر بجلی بن کر اس لیے گری تھی کہ میرا بڑا بھائی آصف اسی جہاز پر سوار تھا۔

مئی کا تو رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ آنکھیں سوچ گئیں۔ آواز بیٹھ گئی اور وہ لونج سے اٹھ کر بستر پر جا پڑیں۔

مئی کا تو رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ آنکھیں سوچ گئیں۔ آواز بیٹھ گئی اور وہ لونج سے اٹھ کر بستر پر جا پڑیں۔ جب ڈیڈ بڈھے بابے کو بیڈروم میں لے گئے تو میں نے سوچا۔ مئی بری طرح سے جھاڑ جھپٹ کریں گی۔ ڈر کے مارے میں تھر تھر کانپتی رہی۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ مئی کی آواز تک نہ آئی۔ ڈیڈ نے اندر سے دروازہ بند کر لیا اور کمرے پر گہری خاموشی چھا گئی۔

کچھ دیر کے بعد میں کی آوازیں آنے لگیں۔ آہستہ آہستہ مدھم جیسے کوئی زیر لب منتیں کر رہا ہو۔ میں بہت حیران ہوئی مئی کس کی منتیں کر رہی ہے۔ مئی اور منت اونہوں مئی نے تو کبھی کسی کی منت نہیں کی۔ اس کی گردن تو ہمیشہ اکڑی رہتی ہے۔ وہ تو ڈیڈی کے سامنے بھی نہیں جھکتیں یہ جاننے کے لیے کہ بات کیا ہے میں نے ٹونی کو پٹی پڑھائی کہ اندر جا کر دیکھے۔

ٹونی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ڈیڈی نے دروازہ کھولا لیکن ٹونی کو اندر داخل ہونے نہ دیا۔ بولے اس وقت نہیں ٹونی تمہاری مئی کی طبیعت اچھی نہیں۔ ٹونی نے کہا باجی میں نے ادھ کھلے پٹ سے دیکھ لیا۔ درمیان میں بڑھا بابا بیٹھا ہے۔ ادھر مئی ادھر ڈیڈی۔ اس رات دیر تک مئی کی سسکیوں کی آوازیں آتی رہیں۔

اگلے روز ایک عجیب بات ہوئی۔ حسنا بازار سے سودا لایا تو اس کے ہاتھوں میں پلاسٹک کے دولوٹے تھے۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ حسنے یہ لوٹے کس کے ہیں۔ بولا مس صاحبہ بیگم صاحبہ نے منگوائے ہیں۔ مئی لوٹا منگائے۔ اونہوں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔

مجھے یاد ہے ایک سال پہلے جب ہم نے یہ والا مکان کرائے پر لیا تھا تو گھر میں پہلے سے ہی پلاسٹک کا کورا لوٹا پڑا تھا۔

مئی نے کہا یہ لوٹا حسنے کو دے دو اس کے کام آئے گا۔

میں نے کہا مئی رہنے دو۔ ہمارے کام کا ہے۔

اس پر مئی پنچے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئی۔ نوٹاٹ لوٹا۔ جگ منگوا لوگ منگوا لو۔ ناٹ لوٹا ناٹ ڈن۔

اور آج مئی نے خود دولوٹے منگوائے ہیں۔ ایک نہیں دو۔ یہ ناٹ ڈن کیسے ڈن ہو گیا بھلا۔

پھر اسی شام ہمارے پڑوسی کی میڈسروٹ رضیہ دو چھوٹے چھوٹے غلچے دے گئی۔

یہ کیا چیز ہے۔ میں نے پوچھا۔

بولی یہ جائے نماز ہیں۔ بیگم صاحبہ نے منگوائے ہیں۔

اسی رات میں نے ممی کے دروازے کے کی ہول سے جھانکامی غالیچے پر کھڑی تھی اور وہ بڑھا بابا آنکھیں موندھے کرسی پر بیٹھا تھا۔ بڑھے کی بے بسی دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے ممی ڈیڈی نے اسے ہائی جیک کر رکھا ہے۔

ممی کو نماز پڑھتے دیکھ کر مجھے بڑا غصہ آیا۔ یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔ سارے ہی ناٹ ڈن۔ ڈن ہو گئے۔ ممی کی تو سمجھو دنیا ہی بدل گئی۔ یوں سادمرادی ہو گئی کہ کچھ حد نہیں نہ پاؤ ڈرنہ سرخی نہ لپ سنک نہ میک اپ نہ ہیر ڈونہ زیور نہ کچھ۔ ڈریس بدل گیا۔ دوپٹہ ماتھے پر لٹکتے لگا۔ سارے سوشل وزٹ منسوخ ہو گئے۔ کوئی آتا تو ریگریٹ کر دیتے۔ ممی بیڈریسٹ پر ہیں ڈیڈی گھر پر نہیں۔ حالانکہ دونوں اندر ہوتے۔ ہر وقت اندر ہی گھسے رہتے۔

جس روز ہائی جیکرز نے نوجوان اہلکار کو گولی مار کر ہلاک کیا تھا۔ اس روز تو ممی کے کمرے سے خوفناک آوازیں آتی رہی تھیں۔ ہچکیاں، سسکیاں اور دہی دہی چیخیں۔ تو بہ ہے۔ دودن ہمارے گھر کی حالت غیر رہی۔

پھر دفعتاً خبر آئی کہ ہائی جیکرز نے مسافروں کو آزاد کر دیا ہے۔ یہ خبر سن کر ممی ڈیڈی کمرے سے باہر نکل آئے اور ٹی وی کے سر ہانے بیٹھ گئے۔ بیٹھے رہے حتیٰ کہ خبر کی تصدیق ہو گئی۔

اسی شام ڈیڈی ممی ہوائی جہاز میں بیٹھ کر بھائی کو ریسیو کرنے کراچی چلے گئے اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ پتہ نہیں وہ بڑھا بابا کب بیڈروم سے باہر نکلا۔ میں نے اسے نکلنے دیکھا نہیں۔

چار ایک دن کے بعد ممی ڈیڈی آصف بھائی کو ساتھ لے کر آ گئے۔ ہم تو بھائی کو دیکھ کر کھل گئے۔ پورے چار دن بھائی یہاں رہے۔ تو بہ بھائی کی گپیں

اور چھیڑ خانیاں اور لطیفے اور لٹی سیدھی باتیں۔ اتنا ہنگامہ رہا کہ وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ اتنی رونق رہی کہ کچھ حد نہیں۔ پھر وہ چلے گئے اور گھر پھر سے وہی گھر بن گیا۔

ممی پھر سے وہی ممی بن گئیں اور ڈن اور ناٹ پھر سے قائم ہو گئے۔ لوٹے غائب ہو گئے۔ چھوٹے غالیچے صندوق میں بند ہو گئے۔ قرآن الماری میں رکھ دیا گیا۔ ممی کا بیڈروم پھر سے پر اپر بیڈروم بن گیا۔ میک اپ کا سامان باہر نکل آیا۔ شلو اور قمیض غائب۔ دوپٹہ پتہ نہیں کیا ہوا۔ سوشل وزٹس پھر سے چالو ہو گئے۔ اور ہمارا گھر پھر سے گھڑی کی طرح ٹک ٹک کرنے لگا۔ اور وہ بابا ہمارے

ذہن سے بالکل ہی خارج ہو گیا۔

پھر ایک دن ٹوٹی میرے پاس آیا کہنے لگا باجی ہماری شل کاک بیک یارڈ کے روشندان میں پھنس گئی ہے ذرا نکال دیجئے۔
 بیک یارڈ میں گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ حسنے کے کوارٹر کے سامنے امرود کے پیڑ تلے وہی بابا ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا ہے۔
 مائی گاڈ یہ یہاں کیوں بیٹھا ہے۔

میرے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مود باندا ٹھکھڑا ہوا بولا۔ مس صاحبہ کیا صاحب نے بلایا ہے میں
 آؤں؟

اس پر میں ہکی ہکی رہ گئی۔ لو صاحب اسے کیوں بلائیں گے بھلا خواہ مخواہ۔

اس کے بعد جب بھی میں بیک یارڈ میں گئی تو میں نے اسے وہیں بیٹھے دیکھا۔ اس پر میں سمجھی کہ یہ بابا ضرور حسنے کا کچھ لگتا ہوگا۔
 ہمارا نوکر حسنا بھی تو پرانی وضع کا آدمی ہے۔ بس سارا دن یا تو وضو کرتا رہتا ہے یا نمازیں پڑھتا رہتا ہے۔ پینڈو ہے نا اس لیے۔
 وہ تو مجھ سے غلطی ہو گئی کہ میں حسنے سے پوچھ بیٹھی۔ نہ پوچھتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ نہ میں ڈر کے مارے تھر تھر کا پتی نہ مجھے بخارا آتا۔
 میں کہتی ہوں وہ اب بھی وہاں بیٹھا ہے۔

وہ ہر آہٹ پر چونک اٹھتا ہے۔ صاحب نے بلایا ہے کیا۔ میں آؤں۔

مائی گاڈ وہ اتنا بے چین کیوں ہے کہ صاحب اسے بلا لے۔ کیا وہ یونہی ہمارے گھر کو ہانٹ کرتا رہے گا۔



ایک تھا بادشاہ

ایک تھا بادشاہ..... ہمارا خدا بادشاہ..... بادشاہ کا نام اسادا تھا۔

جب اسادہ بوڑھا ہو گیا تو اسے یہ فکر دامن گیر ہوئی جیسے کہ ہر بادشاہ کو ہوتی ہے کہ کہیں راج پاٹ اس کے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔

شاہ اسادہ سوچ سوچ کر ہار گیا کہ کون سا طریق کار اختیار کرے۔ چونکہ بادشاہ تھا لہذا کسی سے مشورہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دل کی بات کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا۔ بادشاہ لقمان کے اس کوئے کا مصداق ہوتا ہے جو منہ میں پنیر کا ٹکڑا پکڑے درخت پر بیٹھا ہو۔ درخت کے نیچے شیر وزیر کھڑے یک زبان ہو کر کہہ رہے ہوں ”شاہ عالم آپ کتنے خوش گفتار ہیں۔ بولتے ہیں تو پھول جھڑتے ہیں“ پھول جھڑیں یا نہ جھڑیں پنیر کا ٹکڑا منہ میں ہو تو کیسے بات کرے۔

شاہ اسادا کا وزیر بڑا باتدبیر تھا۔ جیسے وزیر ہمیشہ ہوتا ہے۔ اس حد تک باتدبیر تھا کہ بادشاہ خود اس کی باتدبیری سے خوف زدہ تھا۔

وزیر بادشاہ کی فکر مندی کو بھانپ گیا۔ ایک روز موقع پا کر تھلنے میں بولا: ”عالی جاہ! میری گردن کاٹنے کا حکم صادر فرمائیے“ بادشاہ یہ سن کر بہت حیران ہوا۔ بولا ”تم نے کون سا جرم کیا ہے کہ میں ایسا حکم صادر کروں“

وزیر بولا ”شاہ عالم! اگر بادشاہ سلامت کی پیشانی پر فکر مندی کی سلوٹیں موجود ہوں تو بے شک وزیر گردن زدنی ہوتا ہے۔ عالی جاہ سیانے کہتے ہیں۔ اگر کوئی بات چھپانی مقصود ہو تو اسے ایسے چھپاؤ کہ برتاؤ کے کسی درتچے سے جھانکنے نہ پائے۔ اور اگر جھانکنے تو پھر چھپانا سعی لا حاصل ہے۔ اور عالم پناہ! بادشاہ سلامت کو سعی لا حاصل زیب نہیں دیتی۔“

اب بادشاہ کے لیے کوئی چارہ نہ رہا۔ بولا ”وزیر باتدبیر ہم چاہتے ہیں کہ جیتے جی راج پاٹ اپنے بڑے بیٹے کو سونپ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔“

وزیر نے جواب دیا ”عالی جاہ! اس میں فکر مندی کی کیا بات ہے۔ حکم دیجئے تعمیل ارشاد ہوگی۔“

بادشاہ نے کہا ”وزیر باتدبیر ہم جاننا چاہتے ہیں کہ اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔“

وزیر بولا ”شاہ عالم اویسے تو حکم پر سر تسلیم خم ہے۔ لیکن سیانے کہتے ہیں کہ بادشاہ کا بیٹا نہیں ہوتا“ شہزادہ ہوتا ہے۔ اور شہزادے کا باپ نہیں ہوتا بادشاہ ہوتا ہے۔ آگے آپ مالک ہیں۔“

یہ سن کر بادشاہ گھبرا گیا۔ لیکن خاموش رہا۔

وزیر نے اپنی بات جاری رکھی۔ کہنے لگا ”عالی جاہ! شہزادہ سا جھانا گزشتہ آٹھ سال سے یورپ میں یونیورسٹی آف ویسٹرن آرٹس اینڈ سائنس میں زیر تعلیم ہے۔ شہزادے کی تاجپوشی کا اعلان کرنے سے پہلے ان کا عندیہ معلوم کرنا مناسب رہے گا۔ حکم ہو تو شہزادے سلامت کو بلانے کے لیے اپنی روانہ کر دیا جائے۔“

شہزادے کی آمد کے بعد بادشاہ اور وزیر یہ جان کر حیران رہ گئے کہ سا جھانا کسی صورت بادشاہ بننے پر رضا مند نہ تھا۔

اس میں شہزادے کا کوئی قصور نہ تھا۔ سالہا سال مغربی یونیورسٹی میں تعلیم و تربیت پانے کے بعد وہ بادشاہ کے نام سے ہی الرجک ہو چکا تھا۔

وزیر بولا ”شہزادہ سلامت! آپ کتاب و شنید کے چکر میں آ چکے ہیں۔ یہ کتابی علم جو درس گاہوں میں رائج ہے عملی زندگی میں نہیں چلتا۔

شہزادے نے جواب دیا ”محترم وزیر! بادشاہ پرانے زمانے کی چیز ہے۔ وہ مدت سے مرچکا ہے۔ آپ مجھے بادشاہ بنا کر مرحوم و مغفور نہ کریں۔ میں زندہ رہ کر زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔

وزیر بولا ”شہزادہ عالی! یہ کہنا کہ بادشاہ مرچکا ہے ایک کتابی خوش فہمی ہے۔ عملی زندگی میں وہ آج بھی جوں کا توں زندہ و پائندہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بادشاہ نے بھی بدل لیا ہے خود کو کیا فلاح کر لیا ہے۔ کہیں وہ سفید کپڑوں میں چھپا بیٹھا ہے کہیں خاص قسم کے لباس میں۔ کہیں نمائندے کا سوانگ رچائے بیٹھا ہے کہیں سامراجی طاقتوں کے خلاف نعرے لگا رہا ہے۔ کہیں عوام کی محبت کی بھجوت ملے بیٹھا ہے۔ کہیں خدمت خلق کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ شہزادہ سلامت! یاد رکھئے کہ بھیس بدلنے سے کردار نہیں بدلتا۔“

”یہ بھیس بدلنے کی رسم بھی نئی نہیں“ بادشاہ نے کہا ”بلکہ صدیوں پرانی ہے۔ پرانے زمانوں میں بھی بادشاہ بھیس بدل کر شہر میں گھوما کرتے تھے کہ عوام سے رابطہ قائم ہو۔“

وزیر نے بادشاہ کی بات کاٹی۔ بولا ”گستاخی معاف عالم پناہ! لیکن یہ وضاحت ضروری ہے کہ بادشاہ عوام سے رابطہ پیدا نہیں

کرتے بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ ایسا طرز عمل اپنائیں کہ عوام سمجھیں کہ وہ ان سے رابطہ پیدا کرنے کے خواہش مند ہیں۔“

بادشاہ نے بات کا رخ بدلنے کے لیے کہا ”شہزادہ سا جھانا! تم اپنے چچا آدورا کی مثال سامنے رکھو۔“

”چچا تو بادشاہ نہ تھے۔“ سا جھانا بولا ”وہ تو عوام کے منتخب نمائندے تھے۔“

”بے شک بے شک آپ درست فرماتے ہیں شہزادہ سلامت!“ وزیر بات دبیر نے حامی بھری ”عوام آج بھی یہی سمجھتے ہیں کہ شاہ آدورا بادشاہ نہ تھے اور وہ کوئی کام عوام کی مرضی پوچھے بغیر نہ کرتے تھے۔ عالی جاہ! بادشاہ کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ بادشاہ تو ہو لیکن عوام اسے بادشاہ نہ سمجھیں۔“

”بے شک بے شک۔“ شاہ نے وزیر پر تحسین بھری نظر ڈالی۔

وزیر نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ بولا ”شاہ آدورا عوام کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن ان کی نظر میں ایسا جادو تھا کہ وہ محبت سے بھری ہوئی نظر آتی تھی۔ جب وہ زبان کی لالچی چلاتے تو عوام فرط محبت سے دم ہلانے پر مجبور ہو جاتے۔“

شہزادہ اپنے چچا کا پرستار تھا وزیر کی بات سن کر اسے دھچکا لگا بولا: بادشاہ سلامت! ”سفر کی کوفت کی وجہ سے میں بہت تھک گیا ہوں اجازت ہو تو ذرا آرام کر لوں

ظاہر ہے کہ شہزادے پر پند و نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ وہ مغربی رنگ میں رنگا ہوا ایک نوجوان تھا۔

اسی رات جب بادشاہ ملکہ اکھیمہ کے پاس پہنچا تو وہ ایک ہی نظر میں تاڑ گئی کہ سارگی کے تار ڈھیلے پڑے ہوئے ہیں۔

ملکہ اکھیمہ بڑی سیانی تھی۔ ویسے تو ہر عورت سیانی ہوتی ہے۔ چونکہ اسے ایک ڈھکے چھپے ظل الہی کے ساتھ رہنا سہنا پڑتا ہے۔ رہنا کم سہنا زیادہ۔ لیکن ملکہ تو ایک ننگ دھڑنگ ظل الہی کے زیر سایہ رہتی تھی۔ اس لیے کچھ زیادہ ہی سیانی تھی۔ اس کے لمبی زندگی گویا شطرنج کی بساط تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ پر ایسا ہوتا ضرور ہے۔ کشش ثقل کی روک نہ ہو تو بوٹا آگ نہیں سکتا۔ بندشوں کے کانٹے نہ ہوں تو گلاب پھول نہیں سکتا۔

خیر بادشاہ کو دیکھتے ہی ملکہ سمجھ گئی کہ پیشانی کی سلوٹوں میں دبی ہوئی بات ہونٹوں پر اترنے والی ہے۔ لہذا وہ رنگ روپ ناز خنجرے کے پیادے چلانے میں مصروف ہو گئی۔

جس طرح عورت کا کام یہ ہوتا ہے کہ مرد سے معتبری کا چھلکا اتار کر اندر سے کھلنڈ را بچ نکال لے۔ اسی طرح ملکہ کا کام یہ ہوتا ہے کہ ظل الہی کا پتھر توڑ کر اندر کا انسان باہر نکال لے۔ انسان باہر نکلا تو اس نے ساری بات ملکہ سے کہہ دی۔

شاہ کی بات سن کر ملکہ بولی: ”عالی جاہ! بادشاہت ایک میوہ ہے ایک بار اس کا سواد چھک لو تو منہ کو لگ جاتا ہے۔ پھر چھوڑنے سے نہیں چھوٹتا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ شہزادہ بادشاہ بننا قبول کر لے تو پہلے اس میں بادشاہ بننے کی آرزو پیدا کیجئے۔ پھل کا سواد چھکائیے۔ چاٹ لگائیے۔“

”سودا کیسے چکھائیں؟“ بادشاہ نے پوچھا۔

پہلے اسے جلے جلوسوں میں لے جائیں۔ محل سے نکلے تو طوطیاں بجیں۔ بازاروں سے گزرے تو سیوری کی موٹریں چلاؤں چلاؤں کرتی ہوئی آگے آگے دوڑیں۔ ٹریفک بند ہو جائے۔ پولیس والے راستے روک کر کھڑے ہو جائیں۔ راہ چلتوں کو روک کر زبردستی دور دیہ کھڑے کر دیں جیسے وہ خیر مقدم کے لیے گھر سے نکلے ہوں تاکہ شہزادہ سمجھے کہ وہ لوگ نہیں پروا کرتے ہیں۔ جلسوں میں پر جوش استقبال ہوں۔ زندہ باد کے نعرے لگیں۔ پھول برسائے جائیں۔ فوٹو گرافر تصویریں کھینچیں۔ اخبارات سرخیاں سجائیں۔ تصویریں لگائیں۔ ریڈیو اور ٹی وی والے ان مصور خبروں کو دہرا دہرا کر ناظرین و سامعین کو مفرح کریں۔ لیکن ٹھہریے۔ شاہ عالم“

ملکہ رک گئی۔ ”پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لیجئے کیا شہزادے کو بادشاہ بنانے کا فیصلہ مناسب ہے؟“

اس پر بادشاہ کے پیشانی پر پل پڑ گئے بولا ”کیا مطلب ہے تمہارا ملکہ اکلیہ؟“

ملکہ بولی ”عالی جاہ! اگر شہزادے کے منہ کو سواد لگ گیا تو وہ بادشاہ بننے کے لیے اتنا بے صبر ہو جائے گا کہ آپ نہ بنائیں گے تو بھی بننے کے خواب دیکھے گا۔ اور بن گیا تو وہ بیٹا بن کر نہیں جیئے گا۔ ظل الہی سیانے کہتے ہیں“ ”شیر اس وقت تک شیر نہیں بتا جب تک اس کے منہ کو خون نہ لگ جائے۔“ اس پر بادشاہ چپ ہو گیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔

بہر صورت بادشاہ نے حکم صادر کر دیا کہ شہزادے کو جلے جلوسوں میں گھمایا پھرایا جائے۔ وزیر بات دبیر بولا ”عالی جاہ! اگر نشر و تشہیر مقصود ہے تو بہتر ہوگا کہ آپ ذرائع ابلاغ کا سربراہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو تو بادشاہ نے بریکٹیل تذکرہ پوچھا آپ کا حکم کیا کام کرتا ہے؟“ اس پر گھبرا گیا۔ بولا ”شاہ عالم جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔“

شاہ نے امان دے دی تو وہ بولا ”عالی جاہ! ہمارے دو کام ہیں ایک یہ کہ بادشاہ کو حقیقت حال کی خبر نہ ہونے پائے۔ دوسرے یہ کہ عوام میں یہ گمان پیدا کیا جائے کہ انہیں صورت حال سے باخبر رکھا جا رہا ہے۔

بادشاہ کی سمجھ میں بات نہ آئی بولا بات ہمارے پلے نہیں پڑی۔“ اس پر سربراہ کی باچھیں کھل گئیں۔ بولا: ”عالی جاہ! یہی ہمارا کام ہے کہ بات کہہ دی جائے لیکن پلے نہ پڑے۔ عالی جاہ! ہم پر اعتماد کیجئے۔ ہم ٹیکنیکل اسپرٹ ہیں۔ کام خوش اسلوبی سے سرانجام

دیں گے۔ صرف یہ فرما دیجئے کہ مقصود کیا ہے۔

بادشاہ نے جواب دیا ”ہم چاہتے ہیں کہ شہزادے کے دل میں بادشاہ بننے کی آرزو پیدا ہو جائے۔

سربراہ یہ سن کر گھبرا گیا، بولا ”بادشاہ عالم! یہ تو ایک خطرناک بات ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ طریق کار پرانا ہے۔ جدید طریقہ یہ ہے کہ عوام پر زور مطالبہ کریں کہ شہزادہ گدی سنبھال لے۔ ان کے اس پر زور مطالبے سے مجبور ہو کر شہزادہ تخت نشینی پر رضامند ہو جائے۔“

”آپ عوام کو رضامند کیسے کریں گے؟“ شاہ نے پوچھا۔

”عالی جاہ!“ سربراہ بولا ”عوام رضامند ہوں یا نہ ہوں۔ ہم بار بار اعلان کریں گے کہ عوام کا یہ مطالبہ ہے۔ اس بات کو اتنی بار دہرائیں گے کہ عوام سمجھنے لگیں گے کہ واقعی یہ ہمارا مطالبہ ہے اور یہ گمان کہ شہزادے نے ان کی خواہشات پر تسلیم خم کر دیا ہے ان کے لیے کتنی تسکین کا باعث ہوگا۔“

تو جناب دفتر پہنچ کر سربراہ نے احکامات جاری کر دیئے کہ فی الفور ایسے اقدامات کئے جائیں کہ شہزادہ عوام کی آنکھوں کا تارا بن جائے۔ اس پر محکمے کے کارکن فوراً حرکت میں آ گئے۔ شہزادے کی تصاویر کھینچی گئیں۔ آرٹسٹوں نے ان تصاویر میں رنگ بھرے آنکھوں میں گلیڈ آئی چمکنے لگی، کھلی اور خالی پیشانی پر مردانہ گھوری آ بیٹھی۔ سیدھے ہونٹ خم آلود ہو گئے۔

اس کے بعد اخباروں اور رسائل کے نام ایک سرکلر آرڈر روانہ کیا جس میں ان تصویروں کی کاپیاں ملفوف تھیں تاکہ ان تصاویر کے علاوہ شہزادے کی کوئی اور تصویر اخباروں میں نہ چھپے۔ اخباروں میں ان تصاویر کو جو بھی لڑکی دیکھتی اسے ایسا لگتا جیسے شہزادہ اس کی طرف دیکھ رہا ہے اور اس کی نگاہوں میں اس کے لیے ایک خاص الخاص پیغام ہے۔

اس کے فوراً بعد شہزادے کا ایک انڈیو چھپا جسے محکمے والوں نے مرتب کیا تھا۔ ایک سوال کے جواب میں شہزادے نے کہا کہ میں شاہی خاندان کی لڑکی سے نہیں بلکہ عوامی و رنگ و من سے شادی کروں گا۔ میں ذات پات، عہدے، مرتبے کا قائل نہیں البتہ لڑکی سمارٹ ہو، ذہین ہو، کلچرڈ ہو۔ ضروری نہیں کہ خود خالی یا گوری ہو۔

اس اعلان کے بعد شہزادے کے جلسوں اور جلوسوں میں لڑکیوں کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ مینا بازار کا شہ پڑنے لگا۔ ادھر وزیر باتدبیر نے شاہ کی خدمت میں گزارش کی کہ ”عالی جاہ! جلسے جلوسوں کا پروگرام لانگ ریچ پروگرام ہے فوری نتائج کے لیے مناسب ہوگا کہ شہزادے کو سمجھانے بجھانے کے لیے ایک ٹیوٹر مقرر کر دیا جائے جسے عرف عام میں کمپیٹیشن کہا جائے تاکہ شہزادہ

بدظن نہ ہو۔ میری رائے میں یہ کمپینیں مغربی رنگ میں رنگا ہوا ہوتا کہ شہزادے پر اثر انداز ہو سکے۔“

اس مقصد کے لیے محکمہ تعلقات عامہ نے یونیورسٹی کے بہت سے پروفیسروں سے انٹرویو کئے اور آخر میں ایک ادھیڑ عمر کی ڈپلومیٹک ریلیشنز کی ڈاکٹر مادام زبوری کو منتخب کر لیا گیا۔ فائنل اپروول کے لیے مادام کو بادشاہ کی خدمت میں حاضر کر دیا گیا۔

بادشاہ نے پوچھا ”محترمہ! آج کل بادشاہ کے لیے سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟“

مادام بولی ”عالی جاہ! آج کے دور میں شاہوں کے لیے صرف ایک ہی مسئلہ ہے اور وہ ہے پاور پالیٹکس کا مسئلہ۔“

شاہ نے کہا ”بی بی بندھے نکلے الفاظ میں بات نہ کر۔ یہ بتا کہ پاور پالیٹکس سے تیری کیا مراد ہے؟“

مادام بولی ”عالی جاہ! دنیا میں بادشاہوں کے لیے صرف ایک ہی مسئلہ ہے جو باوا آدم سے آج تک جوں کا توں قائم و دائم ہے اور وہ ہے لائٹھی اور بھینس کا مسئلہ۔ پہلے یہ مسئلہ افراد تک محدود تھا پھر قبیلوں تک جا پہنچا اور آج کل اقوام پر حاوی ہو چکا ہے۔“

”وہ کس طرح؟“ شاہ نے مزید کریدا۔

مادام نے جواب دیا ”شاہ عالم! آج کی دنیا میں کچھ قومیں لائٹھی قومیں ہیں۔ باقی بھینس قومیں ہیں۔ لائٹھی قوموں کی خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ بھینسوں کو ہانک کر اپنے گلے میں لے جائیں ان کا دودھ پیئیں کھال سے اپنے لیے جوتے بنائیں۔ عالی جاہ! ہر بھینس کی خواہش ہے کہ وہ اپنے تحفظ کے لیے کسی لائٹھی قوم کو اپنالے۔ لیکن درپردہ ہر بھینس قوم چاہتی ہے کہ وہ بھی لائٹھی قوم بن جائے۔“

”وہ کیوں؟“ بادشاہ نے پوچھا۔

مادام نے جواب دیا ”عالی جاہ! قدرت کا اصول ہے کہ ایٹ آر بی ایشن اگر تم لائٹھی نہیں بنو گے تو یقیناً بھینس بنا لیے جاؤ گے۔“ وزیر باتدبیر جو اس دوران میں خاموشی سے مادام کی باتیں سن رہا تھا بولا ”مادا! بتائیے کہ بادشاہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟“

مادام بولی ”محترم! بادشاہ خود ایک لائٹھی ہے جو بظاہر عوام کو سہارا دیتی ہے لیکن درپردہ انہیں ہانکتی ہے۔“

بادشاہ یہ سن کر بہت خوش ہوا اور اس نے مادام کو شہزادے کا کمپینیں مقرر کر دیا۔

جب بادشاہ کی والدہ راج ملکہ کو مادام کی تعیناتی کا علم ہوا تو اس نے احتجاج کیا۔ بولی ”بیٹے! تم نے مادام کو شہزادے کا ساتھی بنا کر اچھا نہیں کیا۔“

بادشاہ راج ملکہ کا اشارہ سمجھ گیا بولا ”والدہ محترمہ! مادام ادھیڑ عمر کی عورت ہے۔ شہزادے کی ماں بجا ہے۔“

”یہی تو ڈر ہے“ راج ملکہ بولی ”اگر وہ نوجوان ہوتی تو کوئی اندیشہ نہ تھا۔ ماں بجا عورت گود میں ڈالنے کا گر جانتی ہے۔ شہزادے کو راہ راست پر لانا کچھ مشکل نہ تھا۔ اس کا بیاہ کر دیتے“ شہزادہ چاہے بادشاہ بننے پر رضا مند نہیں لیکن اس کی بیوی ملکہ بننے پر چل جاتی پھر کوئی مسئلہ ہی نہ رہتا۔“

بادشاہ نے کہا ”اپ بجا فرماتی ہیں ہم جلد از جلد شہزادے کے بیاہ کے انتظامات کر دیں گے۔“ اس پر راج ملکہ مطمئن ہو گئی۔ ادھر شہزادے کو علم تھا کہ مادام اس کی اتالیق مقرر کی گئی ہے تاکہ اسے سمجھائے بجھائے۔ اس لیے اس نے مادام سے سردمہری اختیار کر لی۔ مادام نے اس کی سردمہری کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور ایسا رویہ اختیار کر لیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

شہزادہ آخر نوجوان تھا کچھ تھا ایک روز پھوٹ پڑا۔ مادام سے کہنے لگا ”مجھے پتا ہے کہ آپ مجھے سمجھانے بجھانے پر مامور کی گئی ہیں۔“

”ہاں“ مادام نے اثبات میں سر ہلایا ”شاہ عالم یہی سمجھتے ہیں کہ میں شہزادہ سلامت کو سمجھانے بجھانے پر مامور ہوں۔“

مادام بولی ”میں نہیں چاہتی کہ آپ بادشاہ بننے پر رضا مند ہوں۔“

شہزادے نے حریت سے مادام کی طرف دیکھا۔ مادام نے اپنی بات جاری رکھی۔ بولی ”شہزادہ سلامت! یہ بڑے بوڑھے ہم نوجوانوں کے راستے کی رکاوٹ ہیں۔ شہزادہ سلامت! میں جدید تعلیم سے آراستہ ہوں۔ مرد و جدی خیالات سے باغی ہوں۔“

حیرت سے شہزادے کی آنکھیں ابل آئیں۔ بولا ”پھر آپ نے میری اتالیق بننا کیوں منظور کیا۔“

مادام نے جواب دیا ”پیارے شہزادے! مجھے آپ سے بے پناہ ہمدردی ہے۔ آپ کو بڑے بوڑھوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھنے کا صرف یہی طریقہ تھا کہ میں آپ کی اتالیق بن جاؤں۔“

شہزادے کی آنکھوں میں حیرت کی جگہ تحسین جھلکی اور وہ سرک کر مادام کے قریب تر ہو گیا۔ اس کے ارد گرد ایک متا بھری گود پھیل گئی۔ پھیلتی گئی پھیلتی گئی۔ حتیٰ کہ مسلط و محیط ہو گئی۔

تین مہینے کے بعد اخبارات کے پہلے صفحے پر سیاہ حاشیے کے اندر جلی حروف میں خبر چھپی کہ شاہ اسادا، شہزادہ سا جھانا اور ان کی اتالیق کے ہمراہ سیر و تفریح کے لیے اہل سنیشن کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں اتفاقاً کار کا دروازہ کھل گیا۔ شاہ کار سے نیچے پھسل کر گھاٹی میں گر گئے۔ شاہ اسادا کی آخری وصیت کے مطابق اور عوام کے پر زور مطالبے پر شہزادہ سا جھانا اور ملکہ مادام زبوری کی تاجپوشی کی رسم سات دن کے سوگ کے بعد ادا کی جائے گی۔



ایلیٹینز

یہ ایک انوکھے سفر کی کہانی ہے۔

آپ نے عجیب و غریب سفروں کی کہانیاں سنی ہیں۔ سند باد کے سفر، الف لیلوی سفر، گلیور کے سفر۔۔۔۔۔۔ ہاشتیوں میں، دہوقا متوں میں۔

لیکن صائم کی ماں کا یہ سفر بالکل انوکھا تھا۔ وہ کبھی عازم سفر نہ ہوتی تھی۔ نہ ہی رخت سفر باندھا تھا۔ نہ ہاتھ میں لگام تھامی تھی نہ پاؤں رکاب پر رکھا تھا۔

نہ وہ کبھی جہاز پر سوار ہوئی تھی۔ نہ جہاز طوفان سے ٹکرایا تھا۔ نہ وہ بہہ کر کسی انجانے جزیرے کے ساحل پر جا گئی تھی۔ پھر پتہ نہیں کیسے۔۔۔۔۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ایک ان جانی بیگانی مخلوق اس کے گرد بھٹڑ لگائے کھڑی اسے یوں دیکھ رہی ہے جیسے وہ عجوبہ مخلوق ہو۔

یہ سفر اس لحاظ سے انوکھا تھا کہ اماں نے خود حرکت نہ کی تھی بلکہ ایک ایلین ماحول خود بخود چل کر اس کے ارد گرد آکھڑا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگی ”یا اللہ یہ میں کہاں آ گئی ہوں۔ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ لوگ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟“

ان ایلینز میں بہت سے چہرے مانوس دکھتے تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ انہیں جانتی ہو۔ جیسے وہ اس کے ہم سفر رہے تھے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں ایک نظر میں وہ مانوس دکھتے، دوسری نظر میں ایسے لگتا جیسے بیگانہ ہوں۔ ایلینز

پھر اماں کو اپنے پر شک پڑنے لگا۔۔۔۔۔ میں کون ہوں۔۔۔۔۔ کہاں ہوں۔۔۔۔۔ میرا مصرف کیا ہے۔۔۔۔۔
کس لئے ہوں۔۔۔۔۔ کیوں ہوں۔۔۔۔۔؟

اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وہ سوچتی رہی۔ محسوس کرتی رہی۔ سوچتی رہی حتیٰ کہ بیمار پڑ گئی۔ ڈاکٹر نے ٹوٹیاں لگا کر اسے دیکھا۔
ڈاکٹر تو صرف ڈائی گنوسز کرتے ہیں۔ انہیں بیماری سے دلچسپی ہے انسان سے نہیں۔ انہیں ابھی تک شعور نہیں ہوا کہ بیماری روح سے پھوٹی ہے۔ ڈاکٹر بھلا کیا کہتا۔ مریضہ کو کوئی بیماری نہیں۔ صرف کمزوری ہے۔ بڑھا پا ہے۔

جس کا فکر جسم تک محدود ہو وہ کیسے سمجھے گا کہ بڑھاپا عمر سے نہیں ہوتا بلکہ جینے کی امنگ نہ رہے تو اعضا بوڑھے ہو جاتے ہیں۔

اماں میں جینے کی امنگ نہ رہی تھی۔

جینے کی امنگ تبھی قائم رہتی ہے جب کوئی خواہش، کوئی خیال، کوئی امید، کوئی فرد، کوئی مطمح نظر، کوئی سراب آپ انگلی پکڑ کر چلائے۔ جینے کی امنگ تبھی قائم رہتی ہے جب آپ کی اپنی حیثیت ہو، اہمیت ہو۔ آپ کو احساس ہو کہ آپ کا کوئی مصرف ہے۔ کئی ایک سال سے اماں محسوس کر رہی تھی کہ اس کا کوئی مصرف نہیں رہا۔ وہ ایک فالتو ہستی ہے۔

رضائی میں پڑی ہوئی سلوٹ میں جنبش ہوئی۔ ہڈیوں کے ایک ڈھانچے نے سر نکالا۔ بے نور آنکھوں نے صائم کی طرف دیکھا۔ نگاہیں صائم سے پار ہو گئیں۔ اگر اماں کے لئے صائم میں کوئی مفہوم ہوتا تو یقیناً صائم پر رک جاتیں۔ آنکھوں میں لگاؤ کی چمک لہراتی لیکن صائم تو عرصہ دراز سے اس کے لئے ایلین بن چکا تھا۔

صائم آسیہ کا اکلوتا بیٹا تھا جو اس وقت ماں کی چار پائی کی پانکتی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت کمرے میں ماں اور بیٹے کے سوا کوئی نہ تھا۔ آٹھ دن سے وہ اس کی پانکتی پر بیٹھا تھا۔ آٹھ دن سے آسیہ مر رہی تھی۔

دفعاً اس ہڈیوں کے ڈھانچے میں تڑپ پیدا ہوئی۔ آسیہ کی مضطرب لیکن کراکری آواز گونجی۔ ”اب کیا دیر ہے اب کس کا انتظار ہے۔ تم مجھے لے جاتے کیوں نہیں؟“ اس نے ارد گرد کی فضا کو مخاطب کر کے کہا۔ آسیہ کی بات کرنے کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کمرے میں صائم کے علاوہ اور لوگ موجود تھے۔ شاید روح ہوں۔ بیو لے ہوں۔ فرشتے ہوں۔

آٹھ دن سے وہ آسیہ کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ آٹھ دن سے وہ انہیں ڈانٹ رہی تھی۔ ”میرا منہ کیا تک رہے ہو؟ مجھے لے جاتے کیوں نہیں؟ اب کیا دیر ہے؟“

اس نے گھر کے باقی لوگوں سے بات کرنا چھوڑ رکھی تھی۔

گھر میں صرف چند ایک لوگ ہی تو تھے۔ صائم اس کی دونو جوان بیٹیاں سلمیٰ، ستارہ، ایک بیٹا سمیع، بہو اسماء اور صائم کی بیوی

سمینہ۔

عرصہ دراز سے آسیہ ان سب افراد کی زندگیوں سے خارج ہو چکی تھی۔

اگرچہ ان سب کے دلوں میں بوڑھی اماں کی بڑی عزت تھی۔ لیکن عزت تو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ عزت تو کوئی جذبہ نہیں۔ عزت تو تہذیب کی ایک مصنوع ہے جس طرح پلاسٹک کے پھول ہوتے ہیں۔ اماں وہ شہد کی مکھی تھی جس کے ارد گرد پلاسٹک کے پھولوں کا باغ سجا ہوا تھا۔

صرف ایک گھرانے کو اماں سے قلبی تعلق تھا۔ وہ ڈاکٹر صولت کا گھر تھا۔ ڈاکٹر صولت اماں کے بھائی کا بیٹا تھا۔ اس کا گھر ایک جزیرہ تھا جہاں جدید دور کی آندھی اثر انداز نہ ہوئی تھی۔ جہاں ماضی ابھی تک حال کا بہروپ دھارے آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر صولت کا گھر واحد گھر تھا جہاں اماں کے لئے ایلینز نہیں بستے تھے۔ جہاں وقت کو دوام مل گیا تھا۔ جہاں ابھی تک انیسویں صدی چل رہی تھی۔ جہاں بڑی اماں کو محسوس ہوتا کہ وہ اصلی پھولوں پر بیٹھی ہے۔

لیکن صائم کے لئے ڈاکٹر صولت کا گھر ایک دقیانوسی مقام تھا۔ اسے صولت سے شکایت تھی کہ اس نے گھر کو حنوط کر رکھا ہے۔ اور اس حنوط شدہ گھر نے آسیہ کو اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ کہیں اور رہ سکے۔ صولت کی نسبت صائم کا تعلق آسیہ سے کہیں زیادہ پرانا اور گہرا تھا۔

آسیہ اور صائم نے ساہا سال اکٹھے مل کر دکھ سہے تھے۔ اکٹھے مل کر دکھ سہنا گہرا تعلق پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب گرد و پیش ایلین نہ تھا۔ جب آسیہ اپنے دور میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ جب لوگ اس کی بات سمجھتے تھے۔ اسے اہمیت دیتے تھے۔ جب زندگی میں اس کا ایک مقام تھا، مفہوم تھا۔

ان کے دکھوں کی وجہ صرف حالات کی ناسازگاری تھی۔ اس ناسازگاری کی بنیاد ایک عام سحاحادثہ تھا کہ خاوند نے دوسری شادی کر لی تھی اور آسیہ کو ہمیشہ کے لئے گھر کی نوکرائی کی حیثیت دے دی گئی تھی۔

جس باورچی خانے میں اسے رات دن کام کرنا پڑتا تھا، وہاں سے اسے اپنے اور اپنے بیٹے کے لئے طعام نہیں ملتا تھا اس لئے مالک اور مالکن کو کھانا کھانے کے بعد اسے اپنا چولہا جھونکنا پڑتا تھا۔

مالک کے باورچی خانے کا ایک فائدہ ضرور تھا کہ جب وہاں بھنڈی پکتی تو آسیہ بھنڈیوں سے اتاری ہوئی ٹوپیاں لے آتی اور ان سے اپنی ہانڈی پکاتی۔ جب وہاں کریلے پکتے تو کریلوں سے چھیلا ہوا بور پکانے کو مل جاتا۔ نوکرائی کے بیٹے کے لئے بور کریلے تھا، ٹوپیاں بھنڈیاں تھیں، چھلکے سبزیاں تھیں۔

مالک رات گئے گھر آتا تھا اور نوکرائی کو انہیں کھانا کھانے سے پہلے چھٹی نہیں ملتی تھی۔ کھانا کھلا کر جب وہ آؤٹ ہاؤس میں پہنچتی تو بیٹا سوچکا ہوتا۔ پھر وہ چولہا جھونکتی، چھلکے پکاتی اور جب ہانڈی تیار ہو جاتی تو بیٹے کو جگاتی۔ اسے کھانا کھلاتی۔ بیٹا کھا تو لیتا تھا مگر جاگتا تھا اس لئے اسے یاد نہیں تھا کہ بچپن میں اس نے کبھی رات کا کھانا کھایا ہو۔

پھر مالک کا سٹیش اونچا ہو جانے پر ایک ٹرینڈ باوردی نوکر رکھنا لازم ہو گیا۔ اس لئے آسیہ کو نکال دیا گیا اور ماں بیٹا آزاد ہو

گئے۔ آزادی نے انہیں نئے مسائل سے دوچار کر دیا۔ الاؤنس بہت قلیل تھا۔ ضرورت بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں۔

بڑھتی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ماں بیٹے کو محنت مزدوری کرنی پڑتی۔ انہوں نے مل کر چار پائیاں بنیں۔ کتابوں پر جلدیں باندھیں۔ کاغذ کے پھول بنائے۔ پتنگ بنائے۔ دھاگہ خرید کر اس پر مانجھا لگایا تا کہ ڈور بیچ سکیں۔ بچوں کے کھلونے بنائے۔ آسیہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا محنت مزدوری کرے۔ اس کی خواہش تھی کہ ایک سلائی مشین خرید لے اور اکیلی سلائی کا کام کرے۔ لیکن اتنے پیسے نہ تھے۔ پھر کسی مخیر نے قرض کے طور پر پرانی گھسی پٹی سلائی مشین خرید دی اور وہ کپڑے سینے لگی۔

آسیہ ہر فن مولا عورت تھی۔ وہ ہر کام کر سکتی تھی۔ وہ ہر عام سے عام کام میں بھی انفرادیت کی کلیاں ٹانگ دیا کرتی تھی۔ انوکھے کام سوچا کرتی۔ انوکھی چیزیں بنایا کرتی۔ لیکن یہ اس دور کی بات ہے جب ہاتھ کے کام کی قدر نہ تھی، قیمت نہ تھی۔ ان کا باہمی تعلق بہت گہرا تھا۔ اس تعلق کے کئی رخ تھے۔ ماں بیٹے کا تعلق۔ مظلومیت کا تعلق۔ غربت کا تعلق۔ مزدوری کا تعلق۔ دکھ کا تعلق۔

اگر صائم علم حاصل نہ کرتا اور وہ دونوں ہمیشہ کے لئے مزدور رہتے۔ محنت اور مشقت بھری زندگی بسر کرتے اور یہ تعلق جوں کا توں قائم رہتا۔ لیکن علم فینچی بن کر آیا اور اس نے اس عظیم تعلق کے پرزے اڑا دیئے۔

شاید علم دوست اس پر احتجاج کریں اور اپنی جواز پسندی کے تحت تاویل پیش کریں کہ جو خلوص بھرے تعلق کے پرزے اڑا دئے وہ علم دوست نہیں ہو سکتا۔ مجھے کسی حتمی علم کا پتہ نہیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جو رائج الوقت ہو وہی علم ہوتا ہے۔ ہر دور میں رائج الوقت علم کا خصوصی رخ ہوتا ہے۔

آسیہ کے دور میں ایمان لانا تھا۔ صائم کے دور میں شک کرنا۔ تاریخ شاہد ہے کہ علم کا رخ ہمیشہ گرگٹ کی طرح بدلتا رہا ہے۔ صائم کے زمانے میں عقل و خرد کا دور تھا۔ جوں جوں وہ علم حاصل کرتا گیا، جوں جوں عقل و خرد کی آنکھیں کھلتی گئیں، توں توں مضحکہ خیز ہوتا گیا۔ تعلقات کھٹتے گئے۔

صائم کو آسیہ کے خلاف کئی ایک شکایات پیدا ہو گئیں۔ اماں ایسے مرد سے شادی کرنے پر رضامند ہوئی جو کسی ایک عورت کا ہو کر نہیں رہ سکتا تھا بلکہ جسے عورت ذات سے دلچسپی تھی۔ اماں نے اپنے ہی گھر میں نوکرانی بن کر رہنے کو کیوں منظور کیا۔ اماں نے ظلم کے خلاف آواز بلند کیوں نہ کی۔ اماں نے اندھی و فاشعاری کو کیوں اپنائے رکھا۔ شاید اماں غم خور ہو۔ شاید اماں ایذا پسند ہو۔

آہستہ آہستہ صائم کی نگاہ میں مظلوم اماں تسکین پسند آسیہ نظر آنے لگی۔ دکھی اماں ایذا پسندی کی لذت سے سرشار دکھائی دینے

لگی۔ یوں باہمی مظلومیت کا تعلق ٹوٹا گیا۔ دکھ کا تعلق ٹوٹا گیا۔ مزدوری کا تعلق بڑھتا گیا۔ ایذا پسند کے لئے محنت و جدوجہد نہیں ہوتی۔ دکھ دکھ نہیں ہوتا۔ بلکہ انا کی تسکین ہوتی ہے۔ بطخ کے لئے جو ہڑ ہوتا ہے۔

اس عقل و دانش بھری سوچ بچار کی توجہ سے ایک ایسا دن آیا جب دونوں کے درمیان صرف ایک تعلق باقی رہ گیا۔ بیٹے اور ماں کا تعلق۔ لیکن بیٹے اور ماں کا تعلق تو ایک عارضی تعلق ہے جو صرف اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک بیٹا ماں کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ تو ماں کا بیٹے سے تعلق ہے جو واحد دائمی تعلق ہے۔

چونکہ صائم ماں کا محتاج نہیں رہا تھا اس لئے وہ تعلق بھی ٹوٹ چکا تھا۔ صرف برائے نام باقی تھا۔ اس برائے نام تعلق کو ہم رسی طور پر احترام بھی کہتے ہیں۔

احتراماً صائم آٹھ روز سے اماں کی پابندی پہ بیٹھا تھا۔ اور آٹھ روز سے اماں مسلسل مر رہی تھی۔

دیر تک وہ رضائی میں پڑی ہوئی سلوٹ کی طرف دیکھتا رہا، کوئی جنبش نہ ہوئی۔ دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ ”شاید۔۔۔۔۔“ اس نے پھر غور سے اماں کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ میں ڈر نہیں بلکہ امید کی جھلک تھی۔ جیسے اس شاید نے آنکھوں میں دیاروشن کر دیا ہو۔

چونکہ اماں نے منہ رضائی میں ڈھانپ رکھا تھا۔ صائم نے بیٹھے بیٹھے اندازہ لگایا کہ اماں کا دل کہاں ہوگا۔ پھر وہ اس مقام کو نکلتی باندھ کر دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا کہ حرکت ہے یا نہیں۔ وہ مقام بالکل ساکت تھا۔

اس کے دل سے ایک ہلکی سی آواز آئی جیسے کسی نے اطمینان کا سانس لیا ہو۔ پھر ایک سرگوشی سی اٹھی۔ اچھا ہوا۔ بے چاری اس عذاب سے خلاصی پا گئی۔

اس کے اندر رچی بسی ہوئی عقل بول رہی تھی۔

پتہ نہیں کبھی کبھی وہ سرگوشیوں میں کیوں بولتی تھی۔ ایسے کیوں بولتی تھی جیسے وہ احساس گناہ سے بھیگی بھیگی ہو۔

اس کے اندر رچی بسی عقل تو گھر کی ملکہ تھی۔ عرصہ دراز سے گھر پر اس کا راج تھا۔ پھر وہ سرگوشیوں میں بات کیوں کرتی تھی۔ کس سے ڈرتی تھی۔ صائم کے دل میں وہ کون تھا جس کے ڈر سے سہم جاتی۔ شرمسار ہو جاتی۔ ندامت سے بھیگ جاتی۔ اس کی آواز زیر لبی ہو کر رہ جاتی۔

صائم کو تو اپنی عقل پر ناز تھا۔ وہ اپنے آپ کو دانشور سمجھتا تھا۔ محفلوں میں جان بوجھ کر بلند آواز میں ایسے اداریں نکلتے بیان کرنے کا عادی تھا جو دوسروں کو چونکا دیں۔

محفلوں کی بات چھوڑیے۔ اس نے کئی بار اپنی عقل و دانش کے بل بوتے پر ماں سے کہہ دیا تھا۔ ”اماں جب تم مرو گی تو میں دیگیں چڑھا دوں گا۔ غریبوں کو کھانا بانٹوں گا۔ شکرانے کے نفل پڑھوں گا کہ یا اللہ تیرا احسان ہے کہ تو نے میری ماں کو اتنی لمبی عمر دی اور مجھے ماں کے ساتھ اتنی دیر اکٹھے رہنے کا موقع عطا کیا۔ اور ماں میں گھر والوں سے کہہ دوں گا کہ میری ماں کے مرنے پر کوئی نہ روئے۔ کوئی بین نہ کرے۔ رونا اور بین کرنا تو ناشکری کے مترادف ہے۔“

آسیہ کی عمر 95 سال تھی۔ صائم سمجھتا تھا کہ ساٹھ ستر سال کے بعد موت زحمت بن جاتی ہے۔ صائم خود ستر سال کا ہو چکا تھا۔ خود اس کے اپنے ارد گرد ایلین ماحول قائم ہو چکا تھا۔ اس کی اپنی بیٹیاں سلمیٰ اور ستارہ اس کے خیالات اور احساسات سے بیگانہ تھیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہ خود ماضی میں اماں سے بیگانہ ہوا تھا۔

اماں کے ایلین بننے کی بات تو سمجھ میں آتی تھی۔ اماں جدید تعلیم سے آراستہ نہیں تھی۔ لیکن سلمیٰ ستارہ کے ایلین بننے کے بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ صائم کا ماں سے تعلق تو علم نے کاٹا تھا۔ لیکن اولاد سے کٹنے کی ذمہ داری کس پر تھی۔

اس ڈر کے مارے کہ اس کے اپنے بچے اس سے کٹ نہ جائیں وہ مسلسل علم حاصل کرتا رہا۔ رائج الوقت علم زمانے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا تا کہ پیچھے نہ رہ جائے۔۔۔۔۔ پھر بھی۔ وہ پیچھے رہ گیا۔ کیوں؟

اس مسئلہ پر وہ سوچتا رہا تھا۔ ایک بات تو یقینی تھی کہ وہ بے علمی کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ دانش کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ صائم نے کبھی نہ سوچا تھا کہ شاید وہ علم ہی کی وجہ سے پیچھے رہ گیا ہو۔ یہ سوچے بغیر کہ جذبہ تو راستہ ہوتا ہے منزل نہیں۔ منزل کیسی۔۔۔۔۔ ان کے جذبے کا تو کوئی رخ ہی نہ تھا۔ صرف شدت ہی شدت تھی۔ ہانڈی آگ پر چڑھی تھی مگر ہانڈی میں تھا کیا؟

سوچ سوچ کر وہ ہار گیا مگر سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔۔۔۔۔ مثلاً

سلمیٰ کو فلم اس لئے پسند آتی کہ اس میں کوئی خاص اداکار ہوتا۔ اگر وہ اداکار ہوتا تو سب کچھ آپ ہی آپ ہو جاتا۔ فلم کی کہانی عمدہ ہو جاتی۔ فوٹو گرافی شاندار ہو جاتی۔ مکالمے چست ہو جاتے۔

ستارہ کو ٹی وی سیریز اس لئے ناپسند ہوتی کہ اس میں کام کرنے والی کسی ایکسٹرا عورت کی شکل و صورت ایسی ہوتی کہ دیکھ کر اسے گھن آتی۔

سلمیٰ سمجھتی کہ کالج کی فلاں پروفیسر اس قدر عمدہ پڑھاتی ہے کہ ایک ایک لفظ دلنشین ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ بڑی پیاری ہے۔ کتنی پیاری ہے وہ!۔۔۔۔۔ سلمیٰ یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی کہ کوئی بد شکل پروفیسر اچھا پڑھا سکتی ہے۔ ستارہ سمجھتی تھی کہ فلاں مضمون اس لئے اچھا ہے کہ فیشن ایبل سرکلو میں اس کا ذکر رہتا ہے اور فلاں فلاں مضمون اس لئے برا ہے کہ اس میں دقیانوسی سوچیں بھری پڑی ہیں۔

اتفاقاً صائم نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے میں سلمیٰ کھڑی تھی۔ بال لٹک رہے تھے۔ چہرہ ستا ہوا تھا۔ سردروازے کی چوکھٹ سے لٹکا ہوا تھا۔ وہ آسیہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سلمیٰ حزن و ملال کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ گھر کے سارے افراد حزن و ملال سے بھرے ہوئے تھے۔ سارا ماحول حزن و ملال سے بوجھل ہو رہا تھا۔ اس لئے نہیں کہ ماں یادادی مر رہی تھی۔ بلکہ اس لئے کہ گھر میں موت گھس آئی تھی۔ چاروں طرف موت منڈلا رہی تھی۔ سارا گھر موت سے یوں لبالب بھرا ہوا تھا جیسے انار دانوں سے بھرا ہوتا ہے۔

ان جانے میں گھر کا ہر فرد کا آرزو مند تھا کہ وہ بوجھ اٹھائے۔ بوجھل بورڈم دور ہو جائے۔ گھر کا موڈ بحال ہو جائے۔ چاہے بوڑھی اماں پر کچھ بیت جائے۔

سلمیٰ نے اشارے سے پوچھا کہ بڑی اماں کا کیا حال ہے۔

صائم نے مایوسی میں سر ہلادیا۔

سلمیٰ کی اداسی اور گہری ہو گئی۔ سر ڈھلک گیا۔ بال لٹکنے لگے اور ساتھ ہی آنکھوں میں امید کی کرن ناچنے لگی۔

سلمیٰ ایک جذبات لڑکی تھی۔ اسے آسیہ سے بڑی محبت تھی لیکن کیا کرتی، اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے مجبور تھی۔ اس کی چہیتی سہلی شافی کے بیاہ کو صرف آٹھ دن باقی رہ گئے تھے۔ اس نے شافی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اس کے بیاہ پر ملتان آئے گی۔ وہ چاہتی تھی کہ چاہے کچھ ہو جائے، لیکن اس کے ملتان جانے میں رخصت نہ پڑے۔ اور اگر اماں یونہی پڑی رہی تو وہ ملتان نہ جاسکے گی۔

پہلے ہی اماں کی بیماری کی وجہ سے سلمیٰ کی ساری روٹین تباہ ہو چکی تھی۔ مثلاً فون ہی لیجئے۔ فون اس برآمدے میں لگا ہوا تھا جو اماں کے کمرے سے ملحق تھا۔ اماں کی وجہ سے سلمیٰ فون کو آزادانہ طور پر استعمال نہیں کر سکتی تھی۔

پہلے تو عادی طور پر وہ ہر آنے والی کال کو بڑے شوق سے موصول کیا کرتی تھی۔ ان کالوں میں زیادہ تر رانگ نمبر ہوتے تھے۔ وہ ان رانگ نمبروں کو بڑے نخرے سے جھاڑ پلا دیا کرتی۔ یا بڑے تہذیب یافتہ انداز سے مذاق اڑا دیتی۔

خاص سہیلیوں کے علاوہ سلمیٰ کو کسی خاص راسخٹ یا رانگ نمبر سے دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن رانگ نمبر کو کاٹنے میں کتنا مزہ آتا تھا۔ واٹ فون۔۔۔۔۔ اظہار لگاؤ کے جواب میں اظہار بے نیازی میں کتنی لذت ہوتی ہے۔

اماں کی بیماری کی وجہ سے وہ سہیلیوں سے بھی بات نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے تو وہ فون پر گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھی۔ پتہ نہیں کیا باتیں کرتی تھی۔ پاس کھڑے شخص کے کچھ پلے نہیں پڑتا تھا۔ فون پر وہ لمبے لمبے وقفوں کے بعد ایک ایک لفظ بوتلی رہتی۔ ”اچھا۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔ بور۔۔۔۔۔ موڈ نہیں۔ وہ کیسے۔۔۔۔۔“ ایسے الفاظ یا پھر خالی ہنس دیتی۔ چھوٹی ہنسی، لمبی ہنسی، مہذب ہنسی۔ جس میں ہنسی نہ ہوتی، البتہ آواز کے زیر و بم میں جاذبیت ضرور ہوتی۔

سلمیٰ کے لئے اماں کی صحت یا بیماری اہم نہ تھے۔ اہم بات تو یہ تھی کہ اس کی روزمرہ بحال ہو جائے۔ ستارہ کو بھی اماں سے بڑا لگاؤ تھا۔

ستارہ نے اپنی تمام تر اہمیت کا انحصار ہر امتحان میں کلاس میں فرسٹ آنے پر رکھا ہوا تھا۔ اماں کی بیماری کی وجہ سے سارے گھر پر جو بوجھ پڑا ہوا تھا، وہ اس کی پڑھائی میں مغل ہو رہا تھا۔ اسے فکر لگ گیا تھا کہ کہیں رابعہ اس کی پوزیشن نہ ہتھیا لے۔

رابعہ وہ بد صورت بھدی لڑکی تھی جو رٹا لگا لگا کر ہر امتحان میں اس کے پیچھے پیچھے چڑیل کی طرح لگی ہوئی تھی اور ہر بار سیکنڈ آتی تھی۔ کہیں وہ چڑیل میری جگہ نہ لے لے۔ ستارہ کو صرف یہی ایک فکر لگا رہتا تھا۔ بے اللہ۔ اماں کی بیماری کیا مصیبت ہے۔ اس مصیبت سے کب جان چھوٹے گی۔ اسے اس بات پر غصہ آتا تھا کہ اماں ڈاکٹر کا علاج کیوں نہیں کراتی۔

ستارہ کی بات سچی تھی۔ عرصہ دراز سے اماں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ علاج نہیں کرائے گی۔ اسے ڈاکٹروں پر اعتماد نہیں تھا۔ ”اب کیا حال ہے؟“ صائم کی بیوی سمینہ نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا۔

صائم نے مایوسی میں سر ہلا دیا۔

سمینہ چار پائی پر بیٹھ گئی۔ وہ حزن و ملال سے نچڑ رہی تھی۔

سمینہ اور آسیہ کے مابین خدا ترسی کے سوا کوئی تعلق نہ تھا۔ سمینہ ایک مذہبی عورت تھی۔ مذہب اس کے لئے صرف خوف خدا تھا۔ وہ بے چاری خود اس گھر میں اکیلی تھی۔ وہ خود ایلینز میں گھری ہوئی تھی۔ وہ کبھی کیا سکتی تھی۔

اگرچہ آسیہ اور سمینہ کے مابین ساس بہو کا رشتہ تھا لیکن وہ رشتہ ہمیشہ برائے نام رہا تھا۔ سارا قصور آسیہ کا تھا۔ اگر وہ حکم چلانا جانتی تو ساس کا مرتبہ حاصل کر لیتی۔ لیکن وہ توازل سے حکم بجالانا جانتی تھی۔ چوکی پر بیٹھ کر حکم چلانا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لئے بیٹے

کے گھر میں اس کی کوئی حیثیت قائم نہ ہو سکی تھی۔ کیسے ہوتی۔ خود بیٹے نے اسے قائم نہ ہونے دیا تھا۔ جب بھی اماں دل کی بات کرتی، تو صائم عقل و دانش کی قینچی سے اسے کاٹ دیتا۔ ”اماں تم نہیں سمجھتیں.....“

بیٹے کے گھر سے ماں کا صرف ایک تعلق تھا۔

آسیہ میں خدمت اور کام کا جذبہ اس قدر گھر کر چکا تھا کہ جس گھر میں بھی وہ جا کر ٹھہرتی۔ اس گھر کے چھوٹے چھوٹے کام شروع کر دیتی۔ ٹوٹی ہوئی چیزیں جوڑ دیتی۔ صوفوں کے کپڑے دھو کر پھر سے چڑھا دیتی۔ پردے رنگ کر نئے بنا دیتی۔ ٹوٹے ہوئے سوٹ کیس مرمت کر دیتی۔ پرانے کپڑوں کو جوڑ کر نئی کوزیاں بناتی۔ رضائی کے ابرے تیار کرتی۔ میز پوش کے تکتے کے غلاف اور کیا کیا۔

آسیہ کی اس عادت کی وجہ سے لوگ اس کی قدر کرتے تھے۔

بیٹے کے گھر سے ماں کا بس یہی ایک تعلق تھا۔ اسی واسطے سمینہ اسے عزیز رکھتی تھی۔ کسی نے کبھی نہ سوچا تھا کہ یہ تعلق تو نہیں۔ یہ تو مفاد ہے۔ بہر طور سمینہ کا حزن و ملال دلی تھا کیونکہ وہ خدا ترس تھی۔

”کیوں ابا“ سمیع نے داخل ہو کر پوچھا۔ ”کیا حال ہے اماں کا؟“

”ویسا ہی ہے۔“ صائم نے کہا۔

”اوہ۔۔۔۔۔“ سمیع خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر کمرے پر خاموشی طاری رہی۔

”اماں کو ضرور دوا کھانی چاہیے۔“ سمیع بولا

”ہاں“ صائم نے کہا۔ ”لیکن اماں مانے بھی۔“

”ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اماں کے لئے کچھ نہیں کر رہے۔“ سمیع نے کہا۔

”ہاں“

”ایک فیلنگ آف گِلٹ ہے۔“ سمیع گویا اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

سمیع ازلی طور پر مشنری کا رکن تھا۔ اس کے لئے دفتر دفتر نہ تھا بلکہ مقصد حیات تھا۔ کام اس کی زندگی کا مرکز تھا اور یہ مرکز پھیل کر سارے دائرے پر محیط ہو چکا تھا۔ باقی تمام رشتے اور تعلق لگاؤ سمٹ سمٹا کر دائرے کی لکیر پر یوں کھڑے تھے جیسے اوور لوڈڈ بس

میں مسافر یا سیدان پر لٹکے ہوتے ہیں۔

”اوہ“ سمجھ چوٹکا۔ ”مجھے تو جانا ہے۔ دفتر میں فنکشن شروع ہو چکا ہوگا۔ ابو میں واپسی پر ڈاکٹر لے آؤں؟“ اس نے یوں کہا جیسے صرف ڈاکٹر لے آنے سے اماں سے تعلق استوار ہو جائے گا۔ سنس آف گلٹ دور ہو جائے گا۔

”اماں سے پوچھ لو۔“ صائم نے کہا۔

”اماں! اماں جی“ سمیج نے آواز دی۔

اماں نے کوئی جواب نہ دیا۔

پھر سب گھوم کر اماں کے سرہانے کی طرف جا کھڑا ہوا۔ اس نے اماں کے منہ سے رضائی اتار دی۔

”اوہ“ وہ زیر لب چلایا۔ ”اماں تو۔۔۔۔۔۔ اماں تو۔۔۔۔۔۔“

”کیا کہا۔“ کئی ایک چھینیں گونجیں۔

”اماں گزر گئیں کیا؟“

”ہائے اللہ۔۔۔۔۔ اماں چلی گئیں۔۔۔۔۔“

یڑوس والے کہتے ہیں کہ صائم کے گھر سے چیخوں کی آوازیں بلند ہوں گیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں ”نہیں! چیخیں نہیں، وہ تو بگڑے ہوئے قہقہوں کی آوازیں تھیں۔“

میں نے وہ آوازیں نہیں سنیں لیکن میں محسوس کرتا ہوں جیسے صائم کی ماں مری نہیں بلکہ صائم کے گھر سے منتقل ہو کر میری ماں بن کر میرے گھر آ بیٹھی ہے۔ جیسے یہ کہانی صائم کی نہیں بلکہ میری ماں کی ہے۔ شاید تمہاری ماں کی ہو۔ ہم سب کی ماؤں کی ہو۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ گھر گھر بیٹھی ہے۔ اور اس کے ارد گرد ایلینزیوں ناچ رہے ہیں جیسے وحشی قربانی کرنے سے پہلے بلی کے ارد گرد ناچتے ہیں۔



پرانی شراب، نئی بوتل

ہائی کی آواز سن کر نمی نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے ہاتھ میں سیٹو تھو سکوپ لٹکائے اس کی سہیلی صفوکھڑی تھی۔
”ہائیں اس وقت بستر میں۔“ صفو نے پوچھا۔

جسٹ لیرنگ۔ ان بیڈ

میں تو تجھے لینے آئی ہوں۔

کہاں۔

پکچر پر۔

کیوں۔

بڑی چارمنگ پکچر لگی ہے۔ بڑی مشکل سے چھٹی ملی ہے مجھے۔

مشکل سے کیوں۔

بھئی فائل ایر ہے۔ چھٹی کیسے دیں۔ چلو اٹھو۔

اونہوں۔ موڈ نہیں۔

آج آخری دن ہے۔ پکچر اتر جائے گی۔

اتر جائے۔

پتہ ہے لی میجر ہے اس میں۔

اونہوں آج لی میجر بھی ان ہے۔

کون ان ہے آج۔ صفو مسکرائی۔

آج تو صرف نمی ان ہے۔

ویسے لگتی تو اوٹ ہو۔ ناکڈ اوٹ۔

ہانسس۔ نمی نے صفوکا ہاتھ پکڑ کر اسے بستر پر کھینچ لیا۔ بیٹھو باتیں کرتے ہیں۔ ایونگ شو دیکھیں گے آنسٹ۔
گھر والے کہاں ہیں۔ صفو نے پوچھا۔
وہ شہزادی آئی تھی۔ پتہ نہیں کہاں لے گئی ہے۔
کون شہزادی۔
تم نہیں جانتی اسے کیا۔
اونہوں۔

کبھی جانتے ہیں اسے۔ بڑی لاؤڈ وومن ہے۔ اتنی بھڑکیلی ہے کہ دیکھ کر جھر جھری آتی ہے۔ ست رنگ لباس پہنتی ہے۔ جھلمل ٹائپ۔

وہی تو نہیں جو گٹ ٹو گیدر سینک بار پر ملی تھی ہمیں۔ جب تو میں اور انور وہاں بیف برگر کھا رہے تھے۔ یاد نہیں انور نے اسے دیکھ کر کہا تھا۔ یہ تو نری لپس ہی لپس اور پس ہی پس ہے۔

ہاں وہی۔ نمی چلائی۔ وہی تو ہے۔

تمہارے گھر کیسے آ پہنچی۔

ڈیڈی ایک روز انگلی لگا کر لے آئے تھے۔ پھر خود آنے لگی۔

اچھا تو ڈیڈی نے انگلی لگا رکھا ہے۔

اونہوں۔ اب تو وہ ڈیڈی کو انگلی لگائے پھرتی ہے۔

تیرے ڈیڈی بھی سمجھ میں نہیں آتے صفو مسکرائی۔

خواہ مخواہ بالکل ٹرانسپرٹ ہیں۔ اندر جھانکے بغیر دیکھ لو۔

ان کا ایک نہ ایک افیئر تو چلتا ہی رہتا ہے۔

اونہوں۔ افیئر نہیں۔ انہیں صرف اس بات کا شوق ہے کہ کوئی انگلی لگائے پھرے۔ صرف اتنا۔

آگے کچھ نہیں۔

چاہے کوئی لگا لے۔

کوئی ہو یک رنگی ہو ست رنگی ہو بدرنگی ہو۔ ڈیڈی بڑے سٹیمپل ہیں۔ جذبے میں لت پت رہتے ہیں۔ بس ذرا چھیڑ دو۔ فوراً کھل گیا۔

تمہاری می بھی ساتھ گئی ہیں کیا۔
ہاں۔ وہ ہمیشہ ساتھ جاتی ہیں۔ سپرویزن کے لیے۔
کیا مطلب۔ صفونے پوچھا۔
مئی اس ڈر کے مارے چل پڑتی ہیں کہ کچھ ہونہ جائے۔
صفونے قہقہہ مارا۔ جیسے روک ہی لیں گی۔
ہاں۔ اپنی طرف سے تو پورا زور لگاتی ہیں۔ پیورمی۔
مطلب یہ کہ بات ہیں بنتی۔

بات کیسے بنے۔ ڈیڈی تازہ کے قائل ہیں سینٹل کے نہیں اور می کو باسی ہو جانے میں کمال حاصل ہے۔ دراصل می کو ڈیڈی سے عشق ہے۔ اپنا سب کچھ ان کے چرنوں پر ڈال رکھا ہے۔ سب کچھ چرنوں میں ڈال دو تو دوسرا بے نیاز ہو جاتا ہے۔ پھر آہیں بھرو۔ انتظار کرو۔

آئی ہیٹ سچ سا ب سنٹ۔ یہ بات تو پورا نے زمانے میں چلتی تھی۔ اب نہیں چلتی۔
اوجو انور سے بات چل رہی تھی تمہاری وہ۔
آئی لائیکڈ انور۔ آل رائٹ بہت اچھا کمیشن تھا۔ بڑا اگری ایبل۔
لکس بھی تو تھے۔

لکس کی کون پروا کرتا ہے آج کل۔ دے ڈونٹ میٹر۔ پرانے زمانے میں لوگ پری چہرہ ڈھونڈا کرتے تھے۔ سوہنی پر جان دیتے تھے۔ یوسف کی طرف دیکھ کراٹگیاں چیر لیتے تھے۔ اب وہ باتیں گئیں۔
عظمیٰ تو کہتی تھی نمی از سٹرکن ود لوفار انور۔

گڈ لارڈ۔ ناٹ دی سائنگ اینڈ سائنگ ٹائپ۔ میں ہر حد توڑ سکتی ہوں صفو۔ دور جا سکتی ہوں لیکن اتنی دور نہیں کہ واپسی ناممکن ہو جائے۔ لوتو لینڈ آف نور یٹرن میں لے جاتا ہے۔ ہیو گڈ ٹائم، بٹ لوتو نو نیور۔

بھی اس لحاظ سے میں تو ماڈرن نہیں صفو نے کہا۔ پھر وہ نمی کے قریب تر ہو گئی۔ کچھ پتہ ہے وہ آنکھیں مڑا کر بولی تیرے پڑوس میں ڈاکٹر نجی کے ہاں کون آیا ہوا ہے۔

کون ہے؟

لگتا ہے جیسے گلکسو بے بی ہو۔ گہرے بھورے بالوں کا اتنا بڑا تاج گول چہرہ۔ نکھرارنگ اور آنکھوں میں لال ڈورے۔ صفو نے یوں سینہ تھام کر کہا جیسے اندر ہلچل مچی ہو۔
ابجی کی بات کر رہی ہو صفو نے پوچھا۔

تو اسے جانتی ہے

ہاں دو ایک مہینے ہو گئے اسے آئے ہوئے۔

ملنے ملانے کے لیے آیا ہے کیا۔

اونہوں پوسٹنگ ہوئی ہے۔ الاٹ منٹ کے انتظار میں بیٹھا ہے ادھر۔

کوئی ریلیو ہے ڈاکٹر نجی کا۔

نیفٹو قسم کی چیز ہے۔

کیسا لگا تمہیں۔ صفو نے پھر سینہ سنبھالا۔

اچھا خاصہ ہے۔ نمی نے بے پروائی سے کہا۔

اب بنو نہیں نمی۔

میں تو نہیں بنتی۔ وہ بتا ہے پتہ نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے۔

ہے نمی۔ صفو نے پھر سینہ سنبھالا۔ پنک چک شرٹ۔ اورنج سٹراپڈ کوٹ اور شاکنگ۔ گرین ٹائی۔ میں تو دیکھ کر بھونچکی رہ گئی۔

سٹنڈ۔

ہاں چار منگ تو ہے نمی نے کہا۔

سلی۔ چار منگ از نو ورڈ فاراٹ۔ کبھی ملی ہو اس سے۔

روز آ جاتا ہے۔ ممی نے سر چڑھا رکھا ہے۔

اور تم نے

اونہوں

تم سے بھی ملتا ہے کیا۔

ہاں

پھر۔ صفحہ کا تنفس تیز ہو گیا

پھر۔ نمی آنکھیں بند کر کے پڑ گئی۔

سارا جھگڑا اس پھر کا تھا۔

اسی پھر۔ کی وجہ سے نمی اس روز بستر پر پڑی تھی لیز کر رہی تھی۔ لیز تو خیر بہانہ تھا لیز تو اس وقت ہوتا ہے جب امن ہو۔ اندر جھگڑے کی ہنڈیا پک رہی ہو تو امن کیسا۔ اور امن نہ ہو تو لیز کیسا۔ مانا کہ جھگڑا دل کی اتھاہ گہرائیوں میں تھا جہاں کے شور و غوغا کی آواز ذہن تک نہیں پہنچتی۔ مشکل یہ ہے کہ ذہن تک آواز نہ پہنچے تو بات اور الجھ جاتی ہے۔ خود کو تسلیاں دینا بھی ممکن نہیں رہتا۔ بہر حال سارا جھگڑا اس پھر کا تھا۔

نمی کا دل پوچھ رہا تھا۔ پھر۔

اس کی نحیف آواز سن کر ذہن کہہ رہا تھا پھر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب سرے سے کوئی بات ہی نہیں تو پھر کیسا۔

نمی ایک ماڈرن لڑکی تھی۔ ماڈرن گھر میں پرورش پائی تھی ماڈرن ماحول میں جوان ہوئی تھی۔ اسے اپنے ماڈرن ازم سے عشق تھا عشق۔ چاہے کچھ ہو جائے ماڈرن ازم ہاتھ سے نہ جائے اس کا دل پھر۔ پھر۔ کر رہا تھا۔ کراہ رہا تھا۔ سسکیاں بھر رہا تھا۔ اس وقت نمی کی زندگی کی ایک واحد پر اہم تھی کہ دل کی آواز نہ سنے۔ سنائی دے تو ان سنی کر دے۔ اس کا صرف ایک حل تھا کہ ذہن سے چمٹ جائے اور قریب اور قریب جس طرح جو تک خون کی رگ سے چمٹ جاتی ہے۔

نمی میں ذہن اور دل کی کش مکش پہلے بھی اس شدت سے نہیں ابھری تھی۔ نمی نے زندگی میں چند ایک افیسر چلائے تھے۔

سب سے پہلے سعید تھا۔ ان دنوں وہ بی اے میں پڑھتی تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا معنک لڑکا تھا۔ جب بھی کالج میں نمی اس کے سامنے آتی تو اس کی آنکھیں پھٹ جاتیں منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا اور وہ گویا پتھر کا بن جاتا۔ پھر حواس گم قیاس گم بڑبڑنی کو دیکھتا رہتا۔ دیکھتا رہتا۔ حتیٰ کہ سب کو پتہ چل جاتا کہ وہ دیکھ رہا ہے۔ لڑکے پھبتیاں کتے مذاق اڑاتے لیکن اسے خبر ہی نہ ہوتی۔

پہلے تو نمی کو سعید پر بڑا طیش آتا رہا کہ یہ کیا ڈرامہ لگا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

پھر اسے ترس آنے لگا۔ نن کم پوپ دیکھنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ بے شک دیکھے۔ کون منع کرتا ہے لیکن پہلے دیکھنے کا انداز تو سیکھے۔

پہلے تو نمی کو سعید پر بڑا طیش آتا رہا کہ یہ کیا ڈرامہ لگا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر اسے ترس آنے لگا۔ نن کم پوپ دیکھنے کا سلیقہ بھی نہیں

آتا۔ بے شک دیکھے۔ کون منع کرتا ہے لیکن پہلے دیکھنے کا انداز تو سیکھے۔

دوسرا جی اے اوئیس تھا۔ ادھیڑ عمر۔ ڈیڈی کا ہم کار۔ اسے دیکھنے کا سلیقہ تھا۔ اتنا سلیقہ تھا کہ نظر بھر کر دیکھتا ہی نہ تھا۔ بات ہوئی

نا۔ بھلا دیکھنا مقصود ہوتا ہے کیا۔ لورز بھی کتنے احمق ہوتے ہیں یوں بڑبڑ دیکھنے لگتے ہیں جیسے دیکھنا مقصود ہو۔ یا شاید اتنا دیکھتے ہیں

کہ بھول جاتے ہیں کہ مقصد کیا تھا۔ دیکھنا خود راستے کی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ چلو مان لیا کہ دیکھنا تعارف کے لیے ضروری ہے لیکن

انٹی میسی مقصود ہوتو۔

پھر وہ انور تھا۔ کتنا اچھا کمپینین تھا لیکن اکیلے میں کبوتر سی آنکھیں بنا کر بیٹھ جاتا۔ بھی کوئی بات کرو جو چھیڑ دے۔ کوئی جوک جو

گدگدائے ہنسا دے۔ کوئی منتر پھونکو کہ کلی کھل کر گلاب بن جائے۔ بھلا گھٹنے ٹیکنے سے کیا ہوتا ہے خواہ خواہ کا سینیڈل۔ محبت میں یہی

تو عیب ہے شور و غوغا مچا دیتی ہے۔ دھول اڑا دیتی ہے۔ راستے مسدود کر دیتی ہے۔ مواقع تباہ کر دیتی ہے۔

نمی کے افسرز تو بہت تھے۔ اب انہیں گنوانے کا فائدہ۔ بس تھے۔ دوا ایک تو خاصی دور لے گئے تھے۔ ان تیلیوں نے نمی کو کلی

سے پھول بنا دیا تھا۔ ایسا پھول جو بھنوروں کو بیٹھنے نہیں دیتا لیکن اڑاتا بھی نہیں۔ تیر یوں کی اور بات تھی۔ وہ بھن بھن کر کے شور نہیں

مچاتی تھیں۔ دھول نہیں اڑاتی تھیں۔ لیکن اس گھلیسو بے بی امجی نے آن کر مشکل پیدا کر دی تھی۔

پہلے دن تو باؤنڈری وال سے ہیلو ہیلو ہو گیا۔ امجی نے اپنا تعارف کرادیا۔ دوسرے دن وہ بڑی بے تکلفی سے گھر آ گیا اور نمی کے

چھوٹے بھائی عمران سے چڑی کھیلنے لگا۔ ممی آگئیں تو ان سے کہیں پھر نمی کے پاس آ بیٹھا۔ بات چھپڑدی۔ باتیں تو خیر کلچر ذہنیں لیکن

لگا ہیں بالکل ہی کروڑ چوٹا دینے والی۔ چبھنے والی۔ بڑی ان یو وال۔ بھلا پاس بیٹھ کر کبوتر سی آنکھیں بنانے کا مطلب ایڈیٹ۔

گلیڈ آئی تو خیر ہوا ہی کرتی ہے۔ وہ تو یوں ہے کہ دور بیٹھ کر روٹین ٹاک کرتے کرتے ایک دم گلیڈ آئی کے زور پر جمپ لگایا اور گود

میں آ بیٹھے ذرا سی گدگدی کی اور پھر واپس اپنی سیٹ پر دور جا بیٹھے یہ تو جدید انداز ہے نا۔ اپنی توجہ جتائی۔ گڈ ٹائم کی خواہش کو آنکھوں

میں سجایا اور پھر ایز یو رہو کر ایٹ ایز بیٹھ گئے۔ لیکن مسلسل آڑی تر چھی آنکھیں بنا کر بیٹھے رہنا۔ نان سنس۔

گلیڈ آئی تو گڈ ٹائم کی دعوت ہوتی ہے نا۔ اور آنکھیں بنا کر بیٹھے رہنا تو گویا اس بات کی رٹ لگائے رکھنا ہوا کہ دیکھ میں تیرے بنا

کتنا دکھی ہوں۔

وہ مثبت بات۔ اور یہ خالص بات نیکیلو۔

ہاں تو امجی ویسے تو بڑا پیارا آدمی تھا۔ آدمی کہاں آدمی نما لڑکا۔ اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا۔ بولنا سب کچھ ڈٹتے بس اک ذرا آنکھیں بنانے کی بیماری لگی ہوئی تھی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ نمی پہلے روز ہی امجی کو دیکھ کر بھونچکی رہ گئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا آئیڈیل کپڑے پہن کر سامنے آ کھڑا ہوا ہو۔ وہ تو اچھے میں رہ گئی تھی۔ اب اس اچھے کا اظہار خود سے کیسے کرتی۔ جودل کی آواز پر کان دھرتی تو محبت کی راہ پر گامزن ہو جاتی۔ اس کا انتظار کرتی۔ آہیں بھرتی۔ گھڑیاں گنتی۔ اولڈ فیشن غیر مہذب دقیا نوی باتیں۔

ایک پیاری سی سمارٹ سی خوب صورت لڑکی ماڈرن ازم کو چھوڑ کر دقیا نوی کیوں بنے۔ اس لیے نمی سب کچھ پی گئی اور یوں تن کر بیٹھ گئی جیسے کچھ ہو ہی نہ ہو۔

بہر طور امجی اپنا چکر چلا گیا تھا۔ اگر اس میں آنکھیں بنانے کی بیماری نہ ہوتی تو یقیناً فیئر چل جاتا۔ فیئر تو خیر اب بھی چل پڑا تھا لیکن وہ خالصتاً تفریحی نہ بن سکا۔ اور خالص تفریحی نہ ہو تو فیئر کیسا۔

اس کے بعد امجی نے ایک اور قیامت ڈھائی۔ فیسٹ فلور پر اس کا کمرانمی کی کھڑکی کے عین سامنے کھلتا تھا کبخت نے اپنی کرسی دروازے میں بچھائی اور نمی کی کھڑکی پر نگاہوں کی چاند ماری شروع کر دی۔

اس پر نمی اور بھی چڑ گئی۔ لو بھلا نگاہوں کی چاند ماری کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ان ایسے سری میو رز اور کیا۔ بھی جو ناک کو ہاتھ لگانا ہو تو سیدھا لگا لو ہاتھ کو سر کے پیچھے سے گھما کر لانے کی کیا ضرورت ہے۔

دو ایک مرتبہ اس نے کھڑکی سے جھانکا اور ان جانے میں جھینپ گئی اس پر اسے غصہ آ گیا۔ بھلا جھینپنے کی کیا بات ہے اس میں۔ دیکھ ہی رہا ہے نا۔ احمق کو اتنا نہیں پتہ کہ یوں دیکھنے سے بات بنتی نہیں بگڑتی ہے۔ چلو دیکھنا ہے تو پڑا دیکھے۔ وہ اطمینان سے سر ہانے سے ٹیک لگا کر کتاب پڑھنے لگی۔ لیکن ہر چند ساعت کے بعد کتاب کے صفحے سے دو آنکھیں ابھرتیں۔ دل پھر۔ پھر۔ کرنے لگتا اور وہ پھر سے جھینپ جاتی۔

پھر ایک روز امجی اسے فلم پر لے گیا۔

شاید وہ انکار کر دیتی لیکن نمی کا چھوٹا بھائی عمران ضد کرنے لگا می بھی ان کی طرف دار ہو گئی۔ ہو آ کیا حرج ہے۔

فلم دیکھنے میں واقعی کوئی حرج نہ تھا۔ سارا فساد تو نگاہوں کا تھا نا۔ سینما ہال کے اندھیرے میں نگاہیں تو چلتی ہی نہیں۔ رہا قرب کا سوال تو قرب پر تو اسے کوئی اعتراض نہ تھا۔

جب انجی نے اندھیرے میں اس کا ہاتھ پکڑا تو نمی ذرا نہ جھپنی۔ یہ تو یو یوال بات تھی۔ بارہا وہ اپنے بوائے فرنڈز کے ساتھ فلم دیکھنے گئی تھی۔ وہ اس خوشبودار اندھیرے سے واقف تھی۔ اور اندھیرا خوشبودار ہو تو ہاتھ پکڑنا تو ہوتا ہی ہے۔ انجی نے پکڑا تو نمی نے حسب دستور بازو ڈھیلا کر دیا۔

جلد ہی اس نے محسوس کیا کہ انجی کا دباؤ یو یوال نہیں ہے یو یوال دباؤ تو موقع کی مناسبت پر عمل میں آتا ہے تاہم میں اظہار محبت ہو تو۔ گڈ ٹائم کا اشارہ ہو تو۔ لیکن یہ دباؤ تو مسلسل تھا۔ دباؤ ختم ہوتا تو انجی کی تھیلی نمی کے ہاتھ پر چلنے لگتی جیسے ہاتھ کے بند بند کا جائزہ لے رہی ہو۔ جیسے ہاتھ پر کوئی امریکہ دریافت کرنے میں لگا ہو۔

نمی کی تھیلی پر پسینہ آ گیا۔ ہاتھ کے اس لمس نے پتہ نہیں کیا کر دیا۔ اک ان یو یوال رابطہ قائم ہو گیا۔ دل سے رابطہ۔ دل پھر۔ پھر کرنے لگا۔ یہ کیا مصیبت ہے اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔

جب بھی دل پھر۔ پھر کرنے لگتا تو وہ ہاتھ چھڑا لیتی۔ لیکن کچھ دیر کے بعد ان جانے میں اس کا بازو پھر ادھر ہو جاتا۔ ہاتھ کرسی کے بائیں ہتھے پر ٹک جاتا اور پھر وہی دباؤ۔

بیچاری عجب مشکل میں تھی۔ دباؤ ہوتا تو جی چاہتا کہ یو یوال ہو جائے۔ نہ ہوتا تو جی چاہتا کہ ہو۔

گھر میں وہ روزی ملتے تھے۔ وہ روز آ جاتا تھا۔ نہ آتا تو عمران پکڑ کے لے آتا۔ می آواز دے کر بلا لیتی۔ می کے لیے تو وہ گھر کا فرد بن چکا تھا۔ می پہلے روزی سمجھ گئی تھی کہ وہ نمی میں انٹر سٹڈ ہے نرا گڈ ٹائم نہیں۔ وہ تو خوش تھی پڑھا لکھا لڑکا اور پھر چھوٹے ہی افسر۔ کیریئر رہت بہت بالکل جدید طرز کی اور پھر انڈی پنڈنٹ۔ چچا کے گھر میں صرف الاٹ منٹ کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ پتہ نہیں کس روز مل جائے۔ دور چلا گیا تو شاید توجہ بٹ جائے ہٹ جائے اس لیے وہ چاہتی تھی کہ جلد کچھ ہو جائے۔ آخر نمی کی شادی تو ہونا ہی تھی۔ ایم اے کر چکی تھی۔ رشتے تو آئے تھے لیکن وہ تو سبھی سوشل قسم کے تھے یہ تو جوڑ کا تھا۔

ڈیڈی بھی خوش تھا اس نے پہلے روز ہی بھانپ لیا تھا کہ لڑکا سیریس ہے۔ بیماری لگا بیٹھا ہے ان کی ساری ہمدردیاں انجی کے ساتھ تھیں۔ کیسے نہ ہوتیں وہ خود سیریس نس کی بیماری میں مبتلا تھا۔ بہر طور وہ بے نیاز قسم کا آدمی تھا بات بن گئی تو او کے نہیں تو او کے 'جی' او پس تو ہے ہی۔ بڑا افسر ہے پیچھے مربے ہیں۔ صرف یہی نا کہ ادھیڑ عمر کا ہے۔ بال جھڑ چکے ہیں لیکن نمی کو اپنانے کے لیے کتنا بے

تاب ہے۔ حکومت کرے گی عیش کرے گی۔ بیاہ اسی لیے تو کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد امچی اور نمی کی بہت سی ملاقاتیں ہوئی۔ ہولٹوں میں پارکوں میں سینما گھروں میں۔ انہوں نے شاپنگ کیں۔ ڈرائیونگ پر گئے۔ پکنک سپاٹ دیکھے۔ ان ملاقاتوں میں امچی نے طرح طرح کے حربے آزمائے کہ نمی اس سے اظہار محبت کرے۔ نمی اس ضد پر اڑی رہی کہ امچی کے سر سے عشق کا بھوت اتر جائے۔ وروہ سیدھا سیدھا بوائے فرینڈ بن جائے۔

جب وہ شاپنگ پر جاتے تو امچی کوئی نہ کوئی تحفہ نمی کے لیے خرید لیتا۔ ایک دن اس کی می نے کہا نمی تو نے اسے کوئی تحفہ نہیں دیا۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا۔

نمی نے سوچا کوئی ایسا تحفہ دوں کہ جل کر رکھ ہو جائے۔

مطلب جلانا نہیں تھا بلکہ اشارتا سمجھانا تھا کہ مرد بنو۔ آہیں بھرنا چھوڑو۔ آنکھیں بنانا بے کار ہے۔ بکھاری نہ بنو۔ چھین کر لینا سیکھو۔ اس نے سوچ سوچ کر ایک چارم خریدا۔ ایک روپہلا بریسلٹ جو کلائی پر چوڑی کی طرح پہنا جاتا ہے۔

امچی اس چارم کو دیکھ کر بہت خوش ہوا سمجھا شاید نمی کے دل میں اس کے لیے جذبہ پیدا ہو گیا ہے اسے قطعاً خیال نہ آیا کہ کیپ سیک کے پردے میں نمی اسے چوڑی پہنا رہی تھی۔ بہر حال اس نے بڑی خوشی سے وہ چوڑی پہن لی۔

اسی شام وہ دونوں ڈرائیونگ کے لیے جا رہے تھے دفعتاً ایک ویران جگہ پر امچی نے گاڑی روک لی۔ نمی کا دل خوشی سے اچھلا۔ اس سے پہلے ڈرائیونگ کے دوران کئی بار اسے خیال آیا تھا کہ امچی گاڑی روک لے گا۔ ویران جگہ گاڑی روکنے کی بات تو فیشن تھی۔ کریز تھا۔ یو یوال تھا۔

اس یو یوال سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ لیکن امچی نے کبھی گاڑی نہ روکی تھی۔ اس کی تو ساری توجہ نمی کے چہرے پر مرکوز رہتی یا وہ نمی کے ہاتھ کو تھامے رکھتا یوں جیسے بلور کا بنا ہو۔

اس روز گاڑی رکی تو نمی خوشی سے اچھل پڑی۔ پھر آنکھیں بند کر کے خواب دیکھنے لگی۔ گہرے بھورے بال اس کی طرف لپکے اس کے منہ سے نکرائے پھر سارے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ بریسلٹ والا بازو اس کی کمر میں جمائل ہو گیا۔

اس نے اطمینان کا سانس لیا آج سب نارمل ہو جائے گا۔ کبوترسی آنکھیں بنانے اور خالی خولی ہاتھ تھامنے کی بیماری ختم ہو جائے گی۔ اور پھر وہی یو یوال، گولڈن یو یوال

دیر تک وہ آنکھیں بند کر کے پڑی رہی۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا اس نے آنکھیں کھول دیں ساتھ والی سیٹ پر امچی بیٹھا دیوانہ وار اس

کا ہاتھ چوم رہا تھا۔ ایڈیٹ وہ ملائی کی برف کی کلفی کی طرح جم کر رہ گئی۔

آخر اچھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا بولا۔ نمی آج مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔

اچھا تو بات کرنے کے لیے گاڑی روکی ہے اسے غصہ آ گیا۔ ان حالات میں منہ زبانی بات کی کیا ضرورت ہے۔ خواہ مخواہ باتوں کی جلیبیاں تلنا۔ سلی فول۔

نمی۔ اچھی بولا۔ کیا تمہارے دل میں میرے لیے کوئی محبت نہیں۔

محبت محبت محبت وہ چڑ کر بولی۔ ڈونٹ ٹاک لایک این انکل اچھی۔ بھئی ہم ریشٹل دور میں رہتے ہیں۔ بی ریزن اسبل۔ ذرا سوچو۔ لو کیا ہے ایک متھ ویسے آئی لایک یو آل رائٹ۔

ٹھیک ہے اس نے جواب دیا۔ لیکن میں اپنے سوال کا ڈائریکٹ جواب مانگتا ہوں۔ ڈو یو لوی۔

وہاٹ از لو وہ بولی۔ ایک خود فریبی ایک خود پیدا کی ہوئی فریزی۔ ہے نا۔ کیا تم لو کے جھوٹے سنہرے جال سے آزاد نہیں ہو سکتے۔

نہیں وہ بولا۔ مجھے تم سے محبت ہے آئی لو یومیڈ۔

اوہ۔ اٹ از اے پیٹی۔ نمی کے منہ سے نکل گیا۔

دیر تک وہ خاموش رہے پھر اچھی بولا۔ نمی میں ایک ایسا جیون ساتھی تلاش کرنا چاہتا ہوں جو مجھ سے محبت کرتا ہو۔

وہ ہنسی۔ پھر تم والد سٹی کا رخ کرو۔ یہاں کلچر ڈماحول میں تمہیں سوہنی نہیں ملے گی۔

یہ ان کی آخری گفتگو تھی۔

اگلے روز نمی کو پتہ چلا کہ اچھی شفٹ کر گیا ہے اسے گھر مل گیا ہے۔

یہ جان کر نمی کا دل ڈوب گیا۔

ایک خود کو سنبھالا۔ اچھا ہوا چلا گیا ہے۔ سو واٹ انز آل رائٹ۔

دل کو سمجھانے کے باوجود کئی ایک مہینے بار بار سوتے جاگتے ان جانے میں گہرے بھورے بال اڑتے اس کے چہرے پر ڈھیر ہو

جاتے۔ پھر بریسٹ والا ہاتھ بڑھ کر اسے تھام لیتا۔ بار بار وہ خود کو جھنجھوڑتی۔ چلا گیا ہے تو کیا۔ سو وہاٹ اٹ از آل رائٹ۔

ایک سال بعد نمی کی کے جی اوپس سے شادی ہو گئی۔ اور اسے سب کچھ مل گیا۔ سجا سجا یا گھر نو کر چا کر۔ ساز و سامان۔ کاریں۔

سب کچھ اس کا خاوند اویس بڑا کلچر ڈاڈی تھا۔ اور چونکہ ادھیڑ عمر کا تھا۔ اس کی زندگی کا تمام تر مقصد نو جوان بیوی کو خوش رکھنا تھا۔ بلکہ پائیل کرنا تھا۔

اویس میں بڑی خوبیاں تھیں صرف عمر ڈھلی ہوئی تھی بال گر چکے تھے۔ نانٹ نکل آئی تھی بہر حال نمی خوش تھی بہت خوش۔ شادی کے دو سال بعد ایک روز اویس بریگیٹل تذکرہ کہنے لگا۔ ڈارلنگ وہ تیری ایک ڈاکٹر سہیلی تھی۔ کیا نام تھا اس کا۔ صفوی بات کر رہے ہو

کہاں ہوتی ہے وہ آجکل

پہلے تو پنڈی میں اس کا کلینک تھا۔ اب پتہ نہیں دو سے سال نہیں ملی وہ۔ پنڈی میں کس جگہ کلینک تھا۔

شاید لال کرتی کے چوک میں۔ کیوں کوئی کام ہے صفو سے۔

نہیں تو۔ اویس بولا۔ ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔

دس پندرہ روز کے بعد اچانک صفو آگئی۔

ارے تو صفو نمی خوشی سے چلائی۔

کیسی ہے تو صفو نے پوچھا۔

فٹ ریٹ

ار پو پٹی

پپی از نو ورڈ فاراٹ نمی آنکھیں چکا کر بولی۔

اچھا صفو سوچ میں پڑ گئی۔

بات کیا ہے۔ نمی نے پوچھا۔ کیا اویس ملا تھا تجھے۔

ہاں! ملا تھا۔ صفو نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد کہا۔ تیرے فکر میں گھلا جا رہا ہے۔

وہ میرے فکر میں۔

ہاں ہی از ویری مچ کنسرنڈ۔ ورید

مذاق نہ کرو صفو۔

آئی ایم ڈیڈ سیریس۔ اوہیں کہتا ہے تمہیں ہیلوسی نیشن ہوتے ہیں۔

مجھے۔

ہاں۔

مثلاً۔

کہتا تھا جب اکیلے میں میرے ساتھ ہوتی ہے تو کہتی ہے ڈارلنگ تم بال کیوں نہیں سنبھالتے میرے منہ پر پڑتے ہیں اور صفورک گئی۔
نمی چپ ہو گئی۔

اور جانو تم بریسلٹ تو اتار لیا کرو۔

نان سنس۔ نمی چیچی۔ ایسی بے معنی باتیں میں کرتی ہوں کیا۔

بے معنی تو نہیں۔ صفو بولی۔ میں خود اپنے میاں سے یہی کہا کرتی ہوں۔

کیا۔

کہ بال سنبھال لیا کرو میرے منہ پر پڑتے ہیں اور.....

اور..... اپنا بریسلٹ تو اتار لیا کرو۔

مذاق نہ کرنی چلائی۔

تمہیں پتہ نہیں کیا۔ صفو سنجیدگی سے بولی۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ امجی سے۔



حلوائی کی دکان

کتنی عجیب بات ہے۔

زندگی بھر میری تمنا رہی کہ کوئی مجھ سے سیدھی بات کرے اور میں اسے سیدھا اور صاف جواب دوں۔ لیکن اب جب انور نے مجھ سے دونوں کھلی بات کی ہے۔ تو مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا جواب دوں۔ صبح سے سوچوں میں پڑی ہوں۔ سوچ سوچ کر ہار گئی کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔

میری کیفیت اس پنچھی کی سی ہے جو سالہا سال رکھ رکھاؤ کے پنجرے میں آزادی کی تمنا میں تڑپتا رہے۔ لیکن جب پنجرے کا دروازہ کھل جائے تو خود میں اڑان کی طاقت نہ پائے۔

دارصل انور کی سیدھی بات سن کر میرے ذہن کا فیوز اڑ گیا ہے۔ کیسے نہ اڑتا۔ زندگی بھر کبھی سیدھی بات نہ سنی تھی۔ گھر والے ہمیشہ جلیبیاں تلنے رہے۔ جوانی راستہ تلاش کرو کی بھول بھلیاں میں بیت گئی۔ ہر بات سن کر سوچتی پتہ نہیں بات کا دوسرا رخ کیا ہے۔ ہر بات میرے لیے جادو کا پتارہ ہوتی۔ پہلے خالی پتارہ دکھا دیا جاتا پھر جب بات کھلتی تو اس میں سے پھر رے سے کبوتر اڑ کر باہر آ جاتا۔ خالی پتاروں سے اتنے کبوتر اڑ کر باہر نکلتے دیکھے۔ اتنے کبوتر کہ میں سمجھنے لگی جب تک اندر کبوتر نہ ہو پتارہ خالی ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھے پتہ ہے کہ انور کی بات میں کوئی چھل بل نہیں۔ پھر بھی میں کبوتر کی منتظر بیٹھی ہوں کتنی بد نصیبی ہے۔ میری کہانی بڑی عام سی ہے۔ صرف میری ہی نہیں۔ کھاتے پیتے گھرانے کی ہر جوان لڑکی کی ہے۔

میرا نام ثانیہ ہے میں کوئی خدو خالی لڑکی نہیں ہوں۔ مطلب یہ کہ دہن چھوٹا ہے ٹھوڑی نکلتے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ آنکھیں کشتیاں نہیں۔ بنٹوں کی طرح گول ہیں۔ ناک چھوٹی ہونٹ لٹکا ہوا۔ بیڑا اونچا اور رنگ سفید کیا گندمی بھی نہیں شدھ سا نولا۔ لیکن خدو خال کون دیکھتا ہے آج کل۔ خداداد حسن کے دن ختم ہوئے اب تو خود پیدا کردہ حسن چلتا ہے۔ انگ انگ میں شوخی ہو حرکت میں تڑپ ہو جسم میں پارہ بھرا ہو۔ بس مارلیا میدان اور اگر بات میں بے تکلفی بھی ہو جھجک نہ ہو تو کیا بات ہے۔

جس گھر میں میں نے پرورش پائی وہ صرف کھاتا پیتا ہی نہ تھا۔ بلکہ کفر ٹس ہی کفر ٹس۔ بس جھیل میں کنول اگے ہوئے تھے۔ ساز و سامان کی کوئی حد نہ تھی۔ کام کاج کی مصیبت سے چھٹی نوکروں کی ایک ٹیم تھی۔ بس ایک ہی بندش تھی۔ رکھ رکھاؤ کی بندش وہ ابھی

اکیلے میں نہیں۔ بھئی نو دو لٹے جو تھے۔ کوئی آجاتا تو بندش ہی بندش۔ یوں ہیلو کرو۔ یوں بیٹھو۔ یوں دیکھو۔ یوں بات کرو مطلب یہ کہ خود کو پریزنٹ کرو۔ چینی کی پلیٹ میں رکھ کر دوسرے کے سامنے پیش کرو۔

چینی کی پلیٹ میں رکھ کر خود کو پیش کرنے کے فن میں امی کو کمال حاصل تھا۔ وہ باتوں کی ایسی ایسی جلیبیاں تلتیں کہ حد نہیں۔ بالکل ہی حلوائن تھیں۔ باتوں کے ہار پروتے ہوئے ایسی ایسی کلیاں ٹانگ جاتیں کہ میں ششدر رہ جاتی۔ دو ایک منٹ خود کو سنبھالنے میں لگتے۔

امی کو ملکیتیں گنوانے کا بڑا شوق تھا۔ انہیں یہ بالکل گوارا نہ تھا کہ دوسرا بڑھ چڑھ کر بات کرے۔

زمیندارے کی بات چل نکلتی تو امی جھٹ سے کسی دور دراز مقام پر اپنے چار مربے ایجاد کر لیتی۔ ہاں بہن زمیندارے کی مصیبتوں کی حد ہے کوئی۔ اپنے چار مربے جو خیر پور کے قریب ہیں ہمارے لیے در دوسرے ہوئے ہیں۔ کون ہر مہینے اتنی دور جا کر ان کی دیکھ بھال کرے۔

ولایت میں اونچے عہدوں پر فائز رشتہ داروں کی بات چھڑ جاتی تو امی جھٹ سے ایک آئیل انجینئر کزن اختراع کر لیتیں جسے تیل کمپنی نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر امریکہ میں روکا ہوا تھا۔ اس ڈر کے مارے کہ اگر واپس وطن چلا گیا تو کمپنی کا بھٹہ بیٹھ جائے گا نہلے پر دہلا مارنا امی کا من بھاتا مشغلہ تھا۔

لیکن وہ خالی جلیبیاں ہی نہیں تلتی تھیں۔ اس بات کا بھی خیال رکھتیں کہ ان میں کڑا کا ہو۔ ایسا جیسا ریوڑی میں ہوتا ہے۔ ابا کا طریقہ ذرا مختلف تھا۔ وہ بڑ نہیں ہانکتے تھے۔ ملکیت نہیں جتاتے تھے۔ ان کی بات میں عجیب قسم کا عجز ہوتا۔ ”میں تو کچھ بھی نہیں“ وہ اس انداز سے ادا کرتے۔ کہ سننے والوں کو لگتا جیسے سبھی کچھ ہوں لیکن طبعی عجز کی وجہ سے ظاہر کرنے سے گریز کرتے ہوں۔

املاک کی بات ہوتی تو مسکرا کر کہتے۔ ”جناب املاک تو شانوں پر پڑے بوجھ کی مصداق ہے۔ جو آن پڑا ہے۔ وہی نہیں اٹھایا جاتا۔ مزید کی تمنا کون کرے۔“

خالی عجز ہی نہیں۔ ابامیں اسلام کا رنگ بھی نمایاں تھا۔ کوئی آجاتا تو ان کا اسلام شدت سے ابھرتا۔ یوں جیسے آج تیز ہو جائے تو دودھ میں ابال آ جاتا ہے۔

وہ مسئلے نہیں کرتے تھے۔ بحث نہیں چھیڑتے تھے۔ نہ ہی تلقین کرتے۔ اول تو بات میں جگہ جگہ مناسب مقام پر الحمد للہ انشاء اللہ بسم اللہ کی کلیاں ٹانکتے رہتے سننے والوں کو گمان ہوتا کہ صراط مستقیم ہیں۔ مگر ہیں گیت بر ملا اظہار گوارہ نہیں۔ یا حق دل میں رہے

کی مصداق۔

بہر صورت امی ابا۔ دنوں ہی حلوائی تھے۔ جلیبیاں تلنے میں تاک۔ باتوں کے دھنی اثر ڈالنے میں مشاق۔ امی بات بڑھا چڑھا کر اثر پیدا کرتی۔ ابا عجز کا پردہ ڈال کر اپنی عظمت کا جادو جگاتے۔ بات کے پس پشت صراطِ مستقیم کا ایسا دادرہ بجاتے کہ توجہ بول سے ہٹ کر تال پر مرکوز ہو جاتی۔ بچپن میں تو یہ جلیبیاں تلنے کا شغل مجھے بہت ہی اچھا لگا۔ سوچتی کہ میں بھی کوئی اپنا منفرد انداز اپناؤں اور لوگوں کی توجہ لوٹ کر لے جاؤں۔ لیکن جلد ہی جب میں جوان ہو گئی تو حلوائی کی دوکان میں ایک نیارنگ ابھرا۔

ویسے تو گھر میں مجھے مکمل آزادی تھی۔ لیکن اگر میں کسی کلاس فیلو کی بات کرتی تو امی کے کان کھڑے ہو جاتے جھٹ پوچھتیں کس کا بیٹا ہے وہ۔ باپ کیا کام کرتا ہے۔ اس پر میں بہت حیران ہوتی۔

اس روز انور مجھے نوٹس کی کاپی دینے ہمارے گھر آیا۔ تو امی پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئی۔ یوں اسے دیکھنے لگی جیسے لیبارٹری میں کیڑے کو خوردبین کے نیچے رکھ کر دیکھتے ہیں۔ پھر اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

”تیرے ابا کیا کام کرتے ہیں۔ افسر ہیں یا زمیندار ہے۔“

انور بیچارہ بوکھلا گیا۔ وہ تو ایک بیوہ کا بیٹا تھا۔ جو محنت مزدوری کر کے اسے تعلیم دلوا رہی تھی۔ امی کی باتوں کا کیا جواب دیتا۔ بے چارہ بوکھلا گیا۔ ادھر میں حیران کہ وہ تو میری ریکوسٹ پر نوٹس کی کاپی دینے آیا ہے۔ یہ امی اس کا حسبِ نسب کیوں پوچھنے لگی۔

جب وہ چلا گیا تو امی نے مجھے پاس بٹھالیا۔ بولی ایسے لڑکوں کو منہ نہ لگایا کرو۔

مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا۔ امی وہ تو ہماری کلاس کا فاسٹ ڈویژنر فاسٹ ہے۔

پڑا ہو۔ امی نے جواب دیا۔ تم نے کیا مقابلے کا امتحان دینا ہے۔

اس وقت تو بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ بھانڈا پھوٹ گیا۔

ہوا یوں کہ ہمارے ساتھ والے بنگلے کی گرین کانچ میں نئے کرایہ دار آ گئے۔ کسی تیل کمپنی کے ڈائریکٹر تھے۔ ان کے آتے ہی گرین کانچ کا حلیہ بدل گیا۔ سارے گھر میں یہ موٹا کارپٹ بچھ گیا۔ کمروں میں گیلریز میں میز ہیوں پر جگہ جگہ ڈیکوریشن پوسر رکھ دیئے گئے۔ سنگ روم کی ایک دیوار پر قد دیوار سوئٹرز لینڈ کا ایک منظر پیسٹ کر دیا گیا۔ ڈرائنگ روم میں انوکھے پودوں کے گملے رکھ دیئے گئے۔

گھر میں صرف تین افراد تھے مسٹر این عنایت ان کی بیگم آمنہ عنایت اور ان کا اکلوتا بیٹا عین۔

نئے پڑوسیوں کے آتے ہی گویا ہمارے گھر میں بھی انقلاب آ گیا۔ امی ابا جو کبھی ایک ساتھ نہ بیٹھے تھے۔ کان سے منہ لگا لگا کر باتیں کرنے لگے۔ ان کی سرگوشیوں کا انداز ایسا تھا جیسے لو برڈز ہوں۔ یا اللہ یہ کیا ہوا۔ میں تو حیران رہ گئی۔ کیا وقت کا دھارا الٹا بہنے لگا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کون سا موضوع ہے جس پر دونوں بینڈ اینڈ گلو بنے بیٹھے ہیں۔

کئی ایک بار میں اچانک ان کے سر پر جا کھڑی ہوتی، مگر بے کار۔ میری آہٹ سن کر وہ چپ ہو جاتے اور پھر بات بدل دیتے صرف یہی نہیں ہمارے گھر میں کئی ایک اور تبدیلیاں بھی عمل میں آئیں۔ نئی سجاوٹیں۔ نئے قالین، نئے پردے۔

امی تو گویا آمنہ عنایت پر بک گئیں۔ ہر وقت آمنہ کے تذکرے اس کی تعریفیں، بے کتنی خوش اخلاق خاتون ہے۔ سلیقہ تو اس پر ختم ہے۔ پھر وہ دفعتاً آنٹی بن گئی۔ امی نے گرین کاٹج کے پھیرے لینے شروع کر دیے۔ اتنے تعلقات بڑھائے کہ تکلفات سمٹنے لگے۔ گھر میں کوئی چیز آتی آنٹی کا حصہ الگ کر دیا جاتا۔ اچھی چیز پکتی تو پہلے آنٹی کو چکھائی جاتی ہر مہینے آنٹی کی دعوت کا اہتمام کیا جاتا۔ خیرامی کی تو عادت تھی کہ جس پر سمجھ گئی۔ اسے ماتھے پر لٹکا لیا۔

جہاں تک امی کا سوال تھا وہ تو خیر ٹھیک تھا۔ وقت یہ ہوئی کہ امی نے بار بار مجھے آنٹی کے ہاں بھیجنا شروع کر دیا۔ ثانیہ ذرا آنٹی سے یہ پوچھ آؤ۔ ثانیہ ذرا آنٹی کو یہ دے آؤ ثانیہ ذرا دیکھو تو آنٹی فارغ ہیں۔ ہائیں ثانیہ۔ تو صبح سے آنٹی کی طرف نہیں گئی۔ میں حیران کہ مجھے بار بار آنٹی کے پاس کیوں بھیجا جا رہا ہے۔ بات سمجھ میں نہ آئی۔ پھر ایک روز بلی پھدک کر تھیلے سے باہر نکل آئی۔ اس روز میں اور امی دونوں باہر پلاٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ امی کچھ بن رہی تھی میں پڑھ رہی تھی۔ گرین کاٹج کی طرف سے موٹر سائٹ کرنے کی آواز آئی۔ میں نے ادھر دیکھا آنٹی اور انکل موٹر میں کہیں باہر جا رہے تھے۔

کچھ دیر کے بعد امی نے سراٹھایا بولی ”ثانیہ ذرا آنٹی سے کنفرم کر آؤ کہ آج شام فلم کا پروگرام قائم ہے نا۔“

میں نے حیرت سے امی کی طرف دیکھا۔ میں نے کہا امی آنٹی اور انکل تو ابھی ابھی باہر گئے ہیں۔

اچھا، وہ بولی۔ تو پھر کیا ہے۔ عین تو گھر پر ہی ہے نا اس سے کنفرم کر لو۔

دفعتاً کڑا ہی میں جلیبی شوں شوں کرنے لگی۔

اچھا تو مجھے گلاب جامن بنا کر چینی کی پلیٹ میں رکھ کر عین کی خدمت عالیہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ دفعتاً میری آنکھوں سے پردے ہٹ گئے۔

بلی تھیلے سے باہر نکلی تو کیا دیکھتی ہوں کہ کڑا ہی جلیبیوں سے بھری ہوئی ہے۔

ثانیہ تو ذرا عین کے پاس بیٹھ میں ابھی آئی۔

بیٹی پڑھائی میں کوئی مشکل ہو تو عین سے جا کر پوچھ لیا کر۔ ایم اے ہے وہ۔ تیری آنٹی کہتی ہے ہمیشہ جماعت میں فیسٹ ڈویژن لیا کرتا تھا۔

جتی ہوئی باتیں ایک ایک کر کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔

ارے تو کیا یہ سب نئے ڈیکوریشنز غالیچے پردے میری ہی وجہ سے بدلے گئے تھے۔ یہ سارا رینجمنٹ مجھے عین کی جھولی میں ڈالنے کے لیے ہے اور پھر امی ابا کی سرگوشیاں۔
اس روز حلوائی میری نگاہ میں بالکل ننگے ہو گئے۔

اگر میں خدو خالی لڑکی ہوتی تو چپکے سے گلاب جامن بن کر پلیٹ میں سج جاتی۔ مشکل یہ ہے کہ میں سیلف میڈ گرل ہوں۔ خداداد حسن پر تکبیر نہیں کیا۔ بڑی محنت سے خود میں جاذبیت پیدا کی ہے۔ جو زور بازو سے بنی ہو وہ گلاب جامن نہیں بن سکتی وہ جھولی پھیلانے کی قائل نہیں ہوتی۔ اپنے ہاتھ سے توڑ کر کھانا پسند کرتی ہے۔

اگر میں چاہتی تو عین بے چارے کی کیا حیثیت تھی۔ ایسا لشکارہ مارتی کہ سدھ بدھ ماری جاتی۔ ایسی جلیبی بنتی جسے دیکھ کر عمر بھر منہ سے رال ٹپکتی رہتی۔ لیکن مجھے عین پسند نہ تھا۔ بھدا سا جسم میڈیا کر ڈھن اقلوانس زدہ بے حسی بالکل ہی ”بڈاوا“ نظر آتا تھا اسے تو ایک گوری چنی خدو خالی لڑکی چاہیے تھی۔ جو ہر وقت رضا مندی بھری مسکراہٹ مسکاتی رہے۔ بن سج کر بیٹھی میاں کا انتظار کرتی رہے۔

وہ تو شکر ہے چند ہی دنوں میں عین کا بھید کھل گیا کہ وہ روزی کے گھر آتا جاتا ہے روزی کے گھر کو امی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہاں جو جاتا ہے پھر لوٹ کر نہیں آتا۔ روزی کی ایک نہیں چار جوان بیٹیاں تھیں۔ چینی کی پلیٹ میں چار گلاب جامن۔ یوں عین کا قضیہ ختم ہوا۔

پھر دفعتاً منظر بدلا۔ پڑوس میں چودھری صاحب آجے۔

بیٹھے بٹھائے ابا کو شکار کا شوق چرایا۔ انہوں نے ایک بندوق خرید لی اور چودھری صاحب کے ساتھ باقاعدہ شکار پر جانے لگے۔ گھر میں شکار کا گوشت آنے لگا۔ پھر ڈرائنگ روم میں ہرن کے سینگ آویزاں ہو گئے۔ ایک اونچے سٹول پر بھس بھرا عقاب آ بیٹھا۔ نیچے کارپٹ پر شیر کی کھال بچھ گئی۔ میں تو حیران رہ گئی۔ یہ کیا ہوا۔

باورچی خانے کی طرف نگاہ اٹھائی تو کیا دیکھتی ہوں کہ چولہے پر مٹی کی اتنی بڑی ہانڈی پڑی ہے۔ کونے میں دہی بلونے کی چائی

رکھی ہوئی ہے۔ اور امی نوکر جسے بھینس خریدنے کے منصوبے باندھ رہی ہے۔ لو یک نہ شد دوشد۔

پھر اس کا یا پلٹ کا بھید کھل کر سامنے آ گیا۔ چوہدری صاحب اور چوہدرائیں ہمارے گھر کھانے پر آ گئے۔ میز پر ثابت ماش، گوشت کی کڑاہی، پائے، رس کی کھیر اور سروس کا ساگ۔ مکھن کے پیڑے کے ساتھ سامنے آ گئے۔

کھانے کے بعد امی نے اپنی کڑاہی چڑھا دی، کڑ چھا چلنے لگا۔ امی پہلے تو جگہ جگہ اپنے مربے قائم کرتی رہیں۔ پھر بات کا رخ میری طرف مڑ گیا۔

ثانیہ اتنی گھڑ ہے کہ حد نہیں۔

باورچی خانہ کا حساب کتاب بس ثانیہ ہی جانے۔

مربعوں کا حساب کتاب بس ثانیہ ہی جانے۔

جب ثانیہ چائی کو ہاتھ لگاتی ہے تو مکھن آپ ہی آپ پیڑا بن کر ابھرتا ہے۔ اوہو۔ تو یہ بات ہے۔ ثانیہ کو مکھن کا پیڑا بنا کر چینی کی پلیٹ میں رکھ کر چودہرائیں کو پیش کیا جا رہا ہے لیکن کس کے لیے یہ بھید بھی جلد کھل گیا۔

ایک روز چودہری کا بیٹا علی احمد موٹھیوں لڑکائے سامنے آ بیٹھا۔ اور امی اس کے سامنے بیٹھ کر ثانیہ کی گردان پڑھنے لگی۔ علی احمد تو بالکل ہی پینڈو تھا۔ امی کی ہر بات پر بے تکلفانہ بھونڈا قبضہ لگاتا اور پھر کھجانے لگتا۔ اسے دیکھ کر میں تو لرز گئی۔ یا اللہ کیا میرا مستقبل کڑ چھا اور کڑاہی کے زور پر ہی بنے گا۔

شاید اللہ نے میری سن لی۔ کچھ زیادہ ہی سن لی۔

ابا پرانکوارزی انسٹیٹیوٹ ہو گئی۔ اور ان کی ساری پراپرٹی ضبط کر لی گئی۔ وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے۔ لہذا ہارٹ ایکٹ کا شکار ہو گئے۔

امی بیچاری چارہ دن میں مرجھا کر رہ گئیں۔ سارا رنگ و روغن اڑ گیا۔ نیچے سے ایک کھوسٹ بڑھیا نکل آئی۔ نہ وہ کڑاہی رہی نہ کڑ چھانہ جلیبیاں۔

امی کو سہارا دینے کے لیے میں نے ایک دفتر میں نوکری کر لی۔ میں بھلا نوکری کے لیے کہاں ماری ماری پھرتی وہ تو اتفاق سے انور مل گیا کہنے لگا ہمارے دفتر میں ایک جگہ خالی ہے اگر چاہو تو آ کر جائیں کرلو۔ یوں گھر بیٹھے بیٹھے خواہ مخواہ بوری ہو رہی ہو۔ اسے ہمارے حالات کی خبر تھی نا۔ یوں مجھے اس کے توسط سے نوکری مل گئی۔

چار سال گزر گئے۔

شروع شروع میں دفتر میں مشکلات پیش آئیں۔ کچھ لوگوں نے سمجھا کہ اکیلی لڑکی ہے چلو قسمت آزمائیں۔ کچھ نے آگے بڑھ کر جلیبیاں تلی شروع کیں۔ کچھ نے گلاب جامن کی امید پر رال ٹپکائی۔ پھر انہیں بات سمجھ میں آ گئی کہ ادھر خوش وقتی نہیں چلے گی۔ لہذا سب نارمل ہو گئے۔ انور دور سے ہی دیکھتا رہا۔ نہ شوراشوری نہ سردمہری یوں جیسے میں لڑکی تھی ہی نہیں۔ لیکن کبھار کبھار مجھے ایسے لگتا جیسے وہ مجھے دیکھ نہیں رہا بلکہ نگاہوں سے تول رہا ہے۔

کل شام کی بات ہے کہ انور میرے پاس آیا بولا۔ ثانیہ فارغ ہو کیا؟

کیوں؟ میں نے پوچھا۔

بولا۔ ذرا میرے ساتھ چلو۔

کہاں؟

ایک کام ہے۔

وہ اس قدر سنجیدہ تھا کہ مزید پوچھنے کی ہمت نہ پڑی اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

دفتر کے پچھواڑے کے پلاٹ میں وہ رک گیا۔

میں حیران یا اللہ یہاں کیا کام ہو سکتا ہے بھلا۔

بیٹھ جاؤ۔ وہ بولا۔

میں پتھر کے بچ پر بیٹھ گئی۔ وہ نگاہیں جھکائے میرے سامنے کھڑا رہا۔

دیر تک وہ خاموش رہا۔ یوں جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن کہہ نہ پاتا ہو۔

آخر وہ بولا۔ دیکھو ثانیہ میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ ایک پرانا بوسیدہ گھر ہے اور ایک بوڑھی

ماں ہے۔ وہ اتنی بوڑھی ہو چکی ہیں کہ کام کاج کرنے کے قابل نہیں رہیں۔ وہ رک گیا۔ دیر تک رکا رہا۔ پھر بصد مشکل بولا۔ ثانیہ تم

میرے ساتھ شادی کرو گی، میں تو بکی بکی رہ گئی۔ میرے گرد و پیش دھند لکا چھا گیا۔ پھر اس دھند لکے میں سے انور کی آواز آئی۔

سوچ لو ثانیہ سوچ لو۔ اگر تمہیں گوارہ ہو تو مجھے بتا دینا۔ میں انتظار کروں گا۔

پھر اس دھند لکے میں سے ایک دیا ابھرا۔ ابھرتا چلا گیا۔

مجھے نہیں پتہ میں وہاں کتنی دیر بیٹھی رہی۔ بس بیٹھی رہی مجھے خیال بھی نہ تھا کہ انور شادی کا پیغام دے گا۔
کل سے میں ڈور کے گچھے کی طرح الجھی بیٹھی ہوں کوئی سر نہیں ملتا۔

زندگی بھر مجھے تمنا رہی کہ کوئی مجھ سے سیدھی اور صاف بات کرے۔ سچی بات کرے۔ سچی بات ہونٹوں سے نہیں۔ زندگی بھر میری خواہش رہی کہ مجھے چینی کی پلٹ میں رکھا ہوا گلاب جامن نہ سمجھا جائے۔ لیکن اب انور کی بات سننے کے بعد مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔ دھندلکا بڑھتا جا رہا ہے۔ لیکن وہ مدہم سا دیا۔

امی سے بات کروں۔ وہ تو کرنی ہی پڑے گی۔ کروں گی۔ امی بیچاری کا کیا ہے۔ وہ امی تو رہی ہی نہیں۔ نہ تاج رہا نہ تخت بیچاری سارا دن دھوپ میں کھاٹ پر بیٹھ رہتی ہے۔ کسی بات میں دخل نہیں دیتی۔ منہ پر یوں جھریاں پڑ گئی ہیں۔ جیسے کوئی بلوری گلدان ریزہ ریزہ ہو جائے لیکن ریزے الگ نہ ہوں چٹے رہیں۔ اور ایسا لگے کہ ہاتھ لگا یا تو گر کر ڈھیر ہو جائیں گے۔
میں اٹھ کرا می کے پاس جاتی ہوں۔ امی جان۔ امی جان چونکتی ہیں میری طرف دیکھتی ہیں۔

امی ہمارے دفتر کا ایک لڑکا آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

امی یہ سن کر بالکل ہی دھندلا جاتی ہے۔ مجھ سے

”جی امی“ امی حیرت سے میری طرف دیکھتی ہیں۔

امی اس کا باپ فوت ہو چکا ہے۔ ماں بہت بوڑھی ہے آنہ نہیں سکتی۔ اس لیے وہ لڑکا خود ہی آئے گا۔

دفعتاً امی کی آنکھ میں چمک لہراتی ہے۔ اچھا!

میں کوشش کرتی ہوں کہ شرمناک نہیں۔ امی وہ لڑکا پیغام دینا چاہتا ہے۔

امی کا سار چہرہ دمک اٹھتا ہے۔ چہرے کی سلوٹیں سمٹ کر ناپید ہو جاتی ہیں۔ گردن کھٹک سے ابھرتی ہے اور وہ یوں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے جیسے آج سے چار سال پہلے کی امی ہوں۔

کون ہے وہ امی پوچھتی ہے۔ پھر قریب ہو کر زیر لب کہتی ہے کتنے مرے ہیں۔

میں ہلکی ہلکی رہ جاتی ہوں۔ نہیں امی میرے منہ سے نکل جاتا ہے

تو کیا کوئی بڑا افسر ہے؟ وہ پوچھتی ہیں۔

اب میں کیا جواب دوں۔

افسر نہیں تو کیا کاروبار ہے۔ کارخانے دار ہے۔

میں یوں کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہوں جیسے پتھر کی بن گئی ہوں۔ مجھے خاموش دیکھ کر امی کہتی ہیں، اے کہنا کل کسی وقت مجھ سے مل لے۔ میں کر لوں گی اس سے بات۔

جب سے میں نے امی سے بات کی ہے اس کی تو کایا پلٹ گئی ہے۔ بیٹھی سوچ رہی ہے۔ اپنی پرانی زنگ آلود کڑاہی میں تیل نہیں لیکن وہ یوں بیٹھی ہے جیسے جلیبیاں تیلنے کی مشق کر رہی ہو۔ اسے دیکھ کر میرے ارادے گرد کا دھندلکا بڑھتا جا رہا ہے بڑھتا جا رہا ہے اور وہ دیا۔ یوں جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ مجھے اس دیئے پر ترس آ جاتا ہے اور میں خود پھونک مار کر اسے بجھا دیتی ہوں۔ تاکہ خود کو محفوظ کر لوں۔



وقار محل کا سایہ

وقار محل کی چھتیں گر چکی ہیں لیکن دیواریں جوں کی توں کھڑی ہیں۔ جنہیں توڑنے کے لئے بیسیوں جوان مزدور کئی ایک سال سے کدال چلانے میں مصروف ہیں۔

وقار محل نیو کالونی کے مرکز میں واقع ہے۔ نیو کالونی کے کسی حصے سے دیکھئے کھڑکی سے سر نکالنے، روشن دان سے جھانکنے، تیرس سے نظر دوڑائیے۔ ہر صورت میں وقار محل سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ مضبوط، ویران، بوجھل، رعب دار، ڈراؤنا، سر بلند کھوکھلا، عظیم۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری نیو کالونی آسیب زدہ ہو اور وقار محل آسیب ہو۔ نو جوان دیکھتے ہیں تو دلوں میں غصہ ابھرتا ہے۔ نیو کالونی کے چہرے کا پھوڑا۔ رستی بستی کالونی میں آثار قدیمہ۔ چہرے نفرت سے بگڑ جاتے ہیں۔ ہٹاؤ اسے۔ لیکن وہ محل سے اپنی نگاہیں ہٹا نہیں سکتے۔

بچے دیکھتے ہیں تو حیرت سے پوچھتے ہیں۔ ”ڈیڈی! یہ کیسی بلندنگ ہے؟ بھدی! بے ڈھب! موٹی موٹی دیواریں! اونچی اونچی چھتیں! تنگ تنگ کھڑکیاں۔ اور ڈیڈی کیا یہ لوہے کی بنی ہے۔ اتنے سارے مزدوروں سے بھی نہیں ٹوٹ رہی۔“

بڑے بوڑھے محل کی طرف دیکھتے ہیں تو۔۔۔۔۔ لیکن بڑے بوڑھے تو اس طرف دیکھتے ہی نہیں۔ انہیں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو رہتے ہی محل میں ہیں چوری چھپے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ کسی پر بھید کھل نہ جائے۔

کالج کے لڑکے جو اس کھوکھلے محل کے زیر سایہ پل کر جوان ہوئے ہیں، وقار محل کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اب تو خالی دیواریں رہ گئی ہیں۔ کچھ دنوں کی بات اور ہے۔ لیکن ان کے دلوں سے آواز ابھرتی ہے اور وہ تالیاں پیٹنے لگتے ہیں۔ قہقہے لگانے لگتے ہیں تاکہ وہ آواز ان میں دب کر رہ جائے۔ بہر حال نیو کالونی کا ہر نو جوان وقار محل سے ایک پراسرار لگاؤ محسوس کرتا ہے۔ اگرچہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ لگاؤ نہیں لاگ ہے۔ لیکن اسے پتہ نہیں ہے کہ لاگ تو لگاؤ کا ایک روپ ہے۔ ڈھکا چھپا شدت سے بھرا لگاؤ۔

وقار محل صدیوں سے وہاں کھڑا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب تعمیر ہوا تھا۔ جب سے لوگوں نے ہوش سنبھالا تھا اسے وہیں کھڑے دیکھا تھا۔

پہلے تو لوگ وقار محل پر فخر کیا کرتے تھے۔ پھر نئی پود نے مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ پھر کسی منچلے نے بات اڑادی کہ محل کی دیواروں

وقار محل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ دوڑ کر وقار محل میں جا پناہ لے۔ اس روز جیسے جی پھر سے یاسمین بن گئی تھی۔

اگرچہ شعوری طور پر جی کو وقار محل سے سخت چڑ تھی اور وہ اسے اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتی تھی لیکن دل کی گہرائیوں میں وقار محل اس کے بنیادی جذبات پر مسلط تھا۔ ان جانے میں وہ اس کی زندگی پر یوں سایہ کئے ہوئے تھا جیسے بڑکا بوڑھا درخت کسی گلاب کی جھاڑی پر سایہ کئے ہوئے ہو۔

جی وقار محل کے زیر سایہ پیدا ہوئی تھی۔ وہیں کھیل کھیل کر جوان ہوئی تھی۔ اس کی کوٹھی ایور گرین وقار محل کے عقب میں تھی۔ اس کی تمام کھڑکیاں محل کی طرف کھلتی تھیں۔ دونوں ٹیرسیں ادھر کو نکلی ہوئی تھیں۔ بچپن میں جب وہ یاسمین تھی تو وقار محل اس کے لئے جاذب نظر چیز تھی پھر جوں جوں وہ جوان ہوتی گئی وقار محل اسے بوسیدہ عمارت نظر آنے لگی جو نیو کالونی کے راستے کی رکاوٹ تھی۔ اس کے دل میں یہ گمان بڑھتا گیا کہ وقار محل نو جوانوں کی آزادی کھلنے کے لئے تعمیر ہوا تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ گرتے ہوئے وقار محل کا سایہ اس کے دل کی گہرائیوں پر چھایا ہوا ہے اور اس کی زندگی کے ہر اہم واقعے میں وقار محل کا حصہ تھا۔

مثلاً جب اس میں جوانی کی اولیں بیداری جاگی تھی تو گرتے ہوئے وقار محل کی ٹھک ٹھک نے ہی تو اسے جھنجھوڑ کر جگایا تھا۔ اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ ابھی جسمن تھی بھی نہیں بنی تھی۔ اگرچہ اس کی باجی عفت مدت سے عفت سے اف اور پھر اف سے افی بن چکی تھی۔ چونکہ اف بٹ کا امکان خارج ہو چکا تھا۔

ان دنوں باجی سارا سارا دن اپنے بیڈ پر اوندھے منہ پڑی رہتی تھی۔ پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا تھا۔ افی باجی تو بیڈ پر ڈھیر ہونے والی نہ تھی۔ اس کی تو بوٹی بوٹی تھرتھرتی تھی۔ ابھی یہاں کھڑی ہے ابھی باغیچے میں جا پہنچی۔ لوہ تو میسر پر ٹہل رہی ہے۔ ہائیں وہ تو چلی بھی گئی۔ کسی گٹ ٹو گیدر میں۔ کسی فنکشن میں کسی پارٹی میں۔ ایک جگہ تک کت بیٹھنا افی باجی کا شیوہ نہ تھا۔ پھر پتہ نہیں ان دنوں اسے کیا ہو گیا تھا کہ پلنگ پر گٹھڑی بن کر پڑی رہتی تھی۔ جسمن سمجھتی تھی کہ افی باجی میں واسکوڈے گا ما کی روح ہے۔ اسے خبر نہ تھی کہ واسکوڈے گا مانے امریکہ دریافت کر لیا ہے اور اب تھک ہار کر پڑ گئی ہے۔

ان دنوں می بار بار افی کے بیڈ روم کے دروازے سے چھپ چھپ کر جھانکتی اور حیرت سے باجی کی طرف دیکھتی رہتی۔ وہ باجی سے پوچھ نہیں سکتی تھی۔ پوچھنا الگ رہا، می تو باجی سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ کیسے کرتی بات بات کرتی تو باجی تنک کر کہتی۔ ”می ڈارلنگ آپ نہیں سمجھتیں۔ آپ نہ بولیں۔“ واقعی می نہیں سمجھتی تھی۔ کیسے سمجھتی وہ تو بے چاری سیدھی سادی امی تھی جسے حالات نے

زبردستی می بنادیا تھا۔

جب فاطمہ بیگم کی شادی محمد عثمان سے ہوئی تھی تو وہ اسسٹنٹ تھے، پھر حالات نے سرعت سے پلٹا کھایا اور وہ منیجر ہو گئے اور اب جنرل منیجر تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ محمد عثمان سے ایم اوٹمان ہو گئے تھے۔ لیکن فاطمہ بیگم فاطمہ بیگم ہی رہی تھی۔ وہ فاطمہ زیادہ تھی اور بیگم کم کم۔ تعلیم سرسری تھی۔ سوشل سٹینس کی بھاری بھر کم گھڑی سر پر آ پڑی تھی۔ پھر بھی جوں توں کر کے اس نے رہن سہن کی تبدیلی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا تھا۔ لیکن وہ اپنی شخصیت کو بیگم کا رنگ نہ دے سکے تھی۔

اس پر ایم اوٹمان اگر بیگم سے مایوس ہو گئے تھے تو اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ پھر جو انہوں نے گھر سے ناطہ توڑ لیا اور کلب میں وقت بسر کرنے لگے تو یہ ایک قدرتی امر تھا۔ اس کے علاوہ کلب میں بہت سی بیگمات آتی تھیں جن پر چوکھا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اس کے بعد فاطمہ بیگم گھر میں یوں کونے سے لگ گئی جیسے نیو کالونی کا رہائش کرو سو ہو۔ پھر لڑکیاں جوان ہوئیں تو انہوں نے اسے بالکل ہی بے زبان کر دیا۔

لڑکیوں نے زبردستی سے می بنالیا۔ می کے لفظ سے فاطمہ کو بڑی چڑ تھی۔ کتنا نگ لفظ تھا۔ اس لفظ سے ننگے پنڈے کی بھڑاس آتی تھی لیکن وہ احتجاج نہیں کر سکتی تھی۔ جب اپنی پیٹ جائیاں بار بار کہیں ”می ڈارلنگ“ آپ کو پتہ نہیں آپ نہ بولیں، پلیز“ تو ماں کی زبان پر مہر نہ لگے تو کیا ہو۔ پہلے تو فاطمہ کو شک پڑنے لگا کہ شاید واقعی اسے پتہ نہیں پھر اسے یقین آ گیا کہ اسے پتہ نہیں۔ وہ نہیں جانتی۔ کبھی کبھار اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ جانے سمجھے۔ بولے یا نہ بولے پر کم از کم جان تو لے۔

ان دنوں اسی خواہش کے زیر اثر فاطمہ افعی کے کمرے کے دروازے سے کان لگا کر کھڑی رہتی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ افعی اوندھے منہ بستر پر پڑی رہے۔ یوں پڑے رہے جیسے مصالحوں کے بنے ہوئے منے کے اعضاء کو جوڑنے والا دھاگا ٹوٹ گیا ہو۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ شاید فاطمہ کو بات سمجھ آ گئی۔ وہ دیوانہ وار بھاگی۔ غیر از معمول وہ سیدھی افعی کے ڈیڈی کے پاس پہنچی۔ پھر غیر از معمول میاں بیوی آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے۔ ان سرگوشیوں کے دوران میں میاں اہم اہم کرتے سنتے گئے۔ اتنا اہم اہم کرنا تو انہوں نے مدت سے چھوڑ رکھا تھا۔ ان کے اہم اہم کرنے سے معلوم ہوتا تھا جیسے گھر میں پھر سے محمد عثمان آ گیا ہو۔

کچھ دیر کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا، محمد عثمان باہر نکلے۔ ان کے سر پر ٹوپی تھی اور ہاتھ میں چھری۔ پیچھے پیچھے فاطمہ تھی۔ وہ بڑے وقار سے قدم اٹھاتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ افعی کے بیڈروم میں داخل ہو کر انہوں نے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

جسمن یہ سب تفصیلات کافی آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ڈیڈی اور اہم اہم کر کے بات کریں۔ پھر انہوں نے ٹوپی کیوں پہن رکھی تھی اور ان کے ہاتھ میں چھڑی کیوں تھی۔

پھر باجی کے کمرے سے محمد عثمان کی آوازیں سنائی دے رہی تھی۔ ان کی آواز میں بڑا تحکم تھا یا شاید منت تھی یا شاید دونوں ملے جلے تھے۔ منت بھرا تحکم یا تحکم بھری منت۔

پھر باجی کی غصے بھری آواز سارے گھر میں گونجی۔ ”بچہ میرا ہے میں اسے اپناؤں گی۔ دیکھوں گی مجھے کون روکتا ہے۔“ جسمن سوچنے لگی ”یا اللہ باجی کس بچے کی بات کر رہی ہیں۔ کمرے میں تو صرف باجی، ممی اور ڈیڈی تھے۔ بچہ کہاں تھا؟“ پھر اوپر کوئی کسی کو زد و کوب کر رہا تھا۔ چھڑی چلنے کی آواز آرہی تھیں۔ ساتھ ہی باجی چیخ رہی تھی۔ رورہی تھی۔ کراہ رہی تھی۔ ہٹے بچاری باجی۔۔۔۔۔ جسمن کے دل میں ڈیڈی کے خلاف غصہ کھولنے لگا۔

پھر پٹاخ سے دروازہ کھلا اور ڈیڈی امی سیزھیاں اتر رہے تھے۔ لیکن وہ اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں تھے۔۔۔۔۔ افوہ۔۔۔۔۔ ڈیڈی کا چہرہ لہولہاں ہو رہا تھا۔ ارے ڈیڈی نے شک سے پٹینا تو باجی کو تھا پھر ڈیڈی کا اپنا چہرہ کیوں سو جا ہوا تھا۔ جگہ جگہ سے خون کیوں رس رہا تھا اور وہ اس قدر کھوئے ہوئے کیوں تھے کہ کمرے میں داخل ہونے کی بجائے سیدھے کوٹھی سے باہر نکل گئے تھے۔ جسمن ان کے پیچھے پیچھے گئی تھی۔

دھڑا دڑا اڑام۔۔۔۔۔

اک زبردست دھماکہ ہوا۔

چاروں طرف سے شوراٹھا۔

”وقار محل کی چھت گر گئی۔ وقار محل کی چھت گر گئی۔“

گرد و غبار کا ایک بادل اٹھا اور اس نے نیو کالونی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اسی شام کو باجی ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑ کر چلی گئی۔

ہاں جسمن کو وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔

اس حادثہ کے بعد وہ روز کھڑکی میں کھڑی سوچتی رہی کہ باجی گھر چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی۔ اور اس روز وہ کس بچے کی بات کر رہی تھی۔ اور ڈیڈی کا منہ لہولہاں کیوں تھا اور وقار محل کی چھت کیوں گری تھی۔ وہ وقار محل کی طرف دیکھتی رہتی اور سوچتی رہتی۔ دیکھتی اور

سوچتی رہتی۔ غالباً وہ محسوس کرتی تھی کہ وقار محل اس راز سے واقف تھا۔

پھر ایک روز جب وہ کھڑکی میں کھڑی تھی تو کسی نے چلا کر کہا۔ ”ہائی“ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ اگلے دن پھر ”ہائی“ کی آواز آئی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ پھر چاروں طرف دیکھا لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ تیسرے دن وہ ”ہائی“ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ دو چھوٹی چھوٹی مونچھیں نیچے کولنگ رہی تھیں جس میں سے چٹے سفید دانت چمک رہے تھے۔ اوپر دو چندھیائی سی آنکھوں میں سے گلید آئی چاند ماری کر رہی تھی اور اس کے اوپر بال ہی بال ہی بال۔

پہلی مرتبہ ہائی کو دیکھ کر وہ سخت گھبرا گئی۔ اس کا جی چاہا کہ شرما کر منہ موڑ لے جس طرح ماہ رو شرما کر منہ موڑ لیا کرتی تھی۔ ماہ رو گوری چٹی پنٹھانی تھی جو اپنے باپ کے ساتھ وقار محل سے ملحقہ آؤٹ ہاؤس میں رہتی تھی۔ اس کا باپ وقار محل کا چوکیدار تھا اور اب محل کے ملے کی رکھوالی کیا کرتا تھا۔ ماں مرچکی تھی۔ صرف ایک چھوٹا بھائی تھا۔ سارا دن ماہ رو روٹی ہانڈی میں مصروف رہتی۔ دو پہر کو فراغت ہوتی تو باہر دھوپ میں آ بیٹھتی۔ ماہ رو اتنی گوری تھی اتنی گوری تھی کہ ہر راہرو اسے دیکھ کر رک جاتا۔ جب وہ محسوس کرتی کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے تو اس کا سارا چہرہ گلابی ہو جاتا۔ جیسے کسی نے رنگ کی پچکاری چلا دی ہو۔ پتہ نہیں حیا اس قدر گلابی کیوں ہوتی ہے۔ جسمن نے کئی مرتبہ ماہ رو کو شرماتے دیکھا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی حیا کے غارے کو اپنالے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ ایک ماڈرن لڑکی تھی۔ ماہ رو کی طرح گنوار نہ تھی۔ اور ماڈرن کو یہ زیب نہیں دیتا کہ شرما کر منہ موڑ لے۔ الٹا اسے تو ہائی کے جواب میں ہائی کہنا چاہیے۔

جب پہلی مرتبہ ہائی جسمن کے سامنے آئی تو اس نے بڑی جرات سے کام لیا اور شرما کر منہ موڑا۔ لیکن اس میں اتنی جرات پیدا نہ ہو سکی کہ جواب میں ہائی کہتی۔

دراصل جسمن بڑی مخلص، سچی اور شرمیلی لڑکی تھی۔ جس طرح ساری ماڈرن گرلز ہوتی ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس کے دل میں کئی ایک خوش فہمیاں رچی بسی ہوئی تھیں۔ جس طرح ماڈرن گرلز کے دلوں میں خوش فہمیاں رچی بسی ہوتی ہیں۔ مثلاً اسے کچھ پتہ نہیں تھا لیکن وہ سمجھتی تھی کہ اسے سب پتہ ہے۔ چونکہ ماڈرن گرل کو سب پتہ ہونا چاہیے۔ چاہنے اور ہے میں جو فرق ہے اس کا احساس نہ تھا۔ شعور نہ تھا۔

اس کا دل بہت سے بندھنوں میں جکڑا ہوا تھا۔ مگر وہ سمجھتی تھی کہ وہ آزاد ہے۔ چونکہ ماڈرن گرل پر لازم ہے کہ وہ آزاد ہو۔ بغضوں سے آزاد لگاؤ سے آزاد۔ رکی قید و بند سے آزاد۔

اگرچہ ذہنی طور پر اسے رجعت پسندوں کے خلاف زبردست چڑتھی جیسے کہ ماڈرن گرل کو ہونی چاہیے لیکن دلی طور پر اسے اپنے ماں باپ سے لگاؤ تھا۔ اگرچہ اسے اس کا شعور نہ تھا۔ شعور کیسے ہوتا۔ جب بھی ایسی صورت حال پیدا ہوتی کہ شعور ہونے کا خطرہ لاحق ہو تو وہ اپنی توجہ کسی دوسری بات پر مبذول کر دیتی۔ چونکہ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اسے یہ شبہ نہ پڑ جائے کہ اس کے برتاؤ کی کوئی تفصیل ایسی بھی ہے جو ماڈرن گرل کے شایان شان نہیں۔

ان دنوں اسے یہی ایک فکر دامن گیر تھا کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کرے جو ماڈرن گرل کی شان کے متافی ہو۔ اسے ہائی نے اسے خاصا درہم برہم کر دیا تھا۔ لیکن وہ یہ بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی کہ وہ درہم برہم ہے۔ اتنی چھوٹی سی بات ماڈرن گرل کو بھلا کیسے درہم برہم کر سکتی ہے۔ لہذا وہ درہم برہم نہیں تھی بالکل نہیں تھی۔

پہلی مرتبہ تو اس ہائی نے وقار محل سے سر نکالا تھا۔ پھر وہ جگہ جگہ سے سر نکالنے لگی۔ جب وہ کالج بس میں سوار ہوتی تو وہ بس سٹینڈ سے سر نکالتی۔ جب جسمن کالج کی گراؤنڈ میں ٹہل لگاتی تو وہ پردہ دیوار سے جھانکتی۔ جب وہ مارکیٹ جاتی تو وہ اس کا پیچھا کرتی۔

ہاں صورت حال بہت ہی خراب ہوئی جا رہی تھی۔ پھر اس کے اپنے جسم نے بغاوت کر دی۔ ان دنوں وقار محل میں مزدوروں نے دیواریں توڑنے کا کام شروع کر رکھا تھا۔ ان کی ٹھک ٹھک ساری نیوکالونی میں گونجتی رہتی تھی۔ ایک دن جب جسم کی طبیعت ناساز تھی اور وہ ہیڈ پر لٹی ہوئی اس ہائی کے متعلق سوچ رہی تھی تو دفعتاً وہ حادثہ عمل میں آ گیا۔

ساری شرارت مزدوروں کی اس ٹھک ٹھک کی تھی۔ روز تو وہ ٹھک ٹھک جسمن کے کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر گونجتی تھی اس روز نہ جانے کیا ہوا۔ وہ ٹھک ٹھک سیدھی جسمن کی رانوں سے آنکرائی۔ اور اس کے جسم میں گونجنے لگی۔

جسمن کے جسم میں ایک عجیب سے لرزش جاگی۔ کسی پوشیدہ سپرنگ میں حرکت ہوئی۔ ایک تناؤ سا اٹھا اس نے دل پر دباؤ ڈالا۔ دل کے ایملی فائر نے اسے اچھالا۔ سارے جسم میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ نسیں تن گئیں۔ چھاتیوں سے کچا دودھ رسنے لگا۔ ہونٹ لمس کی آرزو سے بے حال ہو کر لٹک گئے۔ سارا جسم سارنگی کی طرح بجنے لگا۔

اس لمحے میں اسے سب پتہ چل گیا۔ سب کچھ کہ باجی گھر چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی کہ وہ کس بچے کی بات کر رہی تھی کہ بچہ کہاں تھا۔ سب کچھ۔ اس روز وہ جسمن سے جی بن گئی تھی۔ اس کے دل میں شدت سے آرزو پیدا ہوئی۔ ابھی اسی وقت۔ فٹافٹ۔ جلدی کچھ ہو جائے اور واقعی کچھ ہو گیا۔

اسی رات بھی کے بیڈروم کا وہ دروازہ آہستہ سے کھلا جو کوٹھی کے احاطے میں کھلتا تھا اور زیرِ لبی آواز آئی۔۔۔۔۔ ”ہائی“

جی تڑپ کر مری۔

دولکی ہوئی مونچھوں میں چٹے سفید دانت چمک رہے تھے۔

اگلے روز گینی لنگتی ہوئی مونچھوں میں چٹے سفید دانت نکالے چندھیائی ہوئی مگر چڑھ جانے والی سرخ چیونٹیوں جیسی آنکھیں لئے سر پر کالے بالوں کا ٹوکرا اٹھائے صدر دروازے کے راستے سے ایور گرین میں داخل ہوا۔

جب گینی پیدا ہوا تھا تو وہ لڑکا تھا۔ اس کی پیدائش پر ماں باپ نے بڑی خوشیاں منائی تھیں۔ انہوں نے اس کا نام غنی رکھا تھا۔ لیکن جب وہ نوجوانی اور دور جدید میں داخل ہوا تو بہت سی تبدیلیاں عمل میں آ گئیں۔ بال بڑھ کر ٹوکرا بن گئے۔ مونچھیں لنگ گئیں۔ منہ پر پاؤڈر سرفی کی تہہ چڑھ گئی۔ رنگدار قمیض، چمکیلی صدیریاں، منکوں کی مالاکیں اور جانے کیا کیا۔ یوں وہ غنی سے گینی بن گیا تھا۔

ایور گرین میں گینی کی آمد سے کوئی ہلچل پیدا نہ ہوئی۔ پہلے ہی اس سلسلے میں افعی نے بڑی کارکردگی دکھائی تھی۔ اس کے بوائے فرینڈز ایور گرین میں اکثر آیا کرتے تھے اور وہ بڑے شوق سے ان کا ڈیڈی سے تعارف کرایا کرتی تھی۔ مئی سے نہیں چونکہ مئی ڈارلنگ تو سمجھتی نہیں تھی۔ اور اسے سمجھنا بہت مشکل تھا۔

فاطمہ نے گینی کو دیکھا تو سینہ تھام کر رہ گئی۔ افعی کے متعلقہ پرانے زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔ اس کے دل میں از سر نو خدشات نے سراٹھایا۔ لیکن وہ بولی نہیں۔ کیسے بولتی۔ رہے ڈیڈی۔ ڈیڈی کی سب سے مشکل یہ تھی کہ وہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ انہیں ایم اوٹمان بن کر جینا ہے یا محمد عثمان بن کر۔

ان کی تعلیم، سٹیٹس اور پوزیشن اس بات کے متقاضی تھے کہ وہ ایم اوٹمان بن کر زندگی گزاریں۔ اسی وجہ سے خاصی محنت کر کے وہ ایم اوٹمان بنے تھے لیکن کئی بار بیٹھے بٹھائے محمد عثمان ان کے دل میں یوں گھس آتا جیسے ہاتھی چینی کی دکان میں آگھسا ہو۔

محمد عثمان بڑا ضدی تھا۔ غصیل تھا۔ منہ پھٹ تھا۔ کٹھ تھا۔ ایم اوٹمان اسے سمجھاتے۔ دلیلیں دیتے۔ بھی زمانہ دیکھو۔ زمانے کا رنگ دیکھو۔ آج کے تقاضوں پر غور کرو۔ اب یہ پرانی باتیں نہیں چلیں گی لیکن محمد عثمان اپنی بات پر اڑا رہتا۔ اس لحاظ سے ایم اوٹمان بھی گویا ماڈرن گرل تھے۔ ان کی شخصیت کی اوپر لی سطح پر ایم اوٹمان کی جھال تھی لیکن دل کی گہرائیوں میں محمد عثمان براجمان تھا۔

جب گینی کا تعارف ایم اوٹمان سے کرایا گیا تو محمد عثمان نے ان کے کان میں کہا۔ ”دھیان کرنا“ کہیں پھر سے تمہیں سر پر ٹوپی رکھ ہاتھ میں چھڑی پکڑ بیٹی کے کمرے میں جانا نہ پڑے۔“ ایم اوٹمان کو اس بات پر غصہ آیا۔ ”ہٹ جاؤ“ اس نے چلا کر کہا ”میرا دل پراگندہ نہ کرو۔“

پھر وہ گیننی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ آیا کرو، مسٹر گیننی جب بھی فرصت ملے آ جایا کرو۔“

گیننی ایور گرین میں کبھی صدر دروازے سے داخل نہ ہوتا۔ اس کے لئے تو صرف عقبی دروازہ ہی موزوں تھا۔ لیکن جی کو یہ گوارا نہیں تھا۔ وہ ایک ماڈرن گرل تھی اور ماڈرن گرل ”سلائی“ تعلق رکھنے سے نفرت کرتی تھی۔ اس سے اس کی آزاد طبیعت پر حرف آتا تھا۔ اس کی انا مجروح ہوتی ہے۔ ڈھکے چھپے تعلق تو وہ پیدا کرتی ہیں جن پر بندشیں عائد کی جاتی ہیں۔ جو پابندیوں میں جیتی ہیں۔ جی کو اپنا جیون ساتھی بھی تو تلاش کرنا تھا۔ جی کو اس بات کا علم نہ تھا کہ گیننی نے جیون ساتھی بننے یا تلاش کرنے کے متعلق نہیں سوچا۔ گیننی تو گڈ ٹائم اور ایڈ ونچر کا متلاشی تھا۔ جب وہ جی کے مجبور کرنے پر ایور گرین میں داخل ہوا تو ایڈ ونچر کا عنصر ہی ختم ہو گیا۔ ایڈ ونچر تو ہمیشہ عقبی دروازے سے متعلق ہوتا تھا۔ باقی رہا گڈ ٹائم۔ تو آپ جانتے ہیں گڈ ٹائم میں تنوع کا ہونا ضروری ہے۔ ایک ہی سر دبائے رکھنے سے نفع نہیں بنتا۔

اس لئے جوں جوں دن گزرتے گئے۔ ٹائم میں گڈ کا عنصر بتدریج کم ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ صرف ٹائم ہی ٹائم رہ گیا اور اس خالی خولی ٹائم سے اکتا کر گیننی ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گیا۔

گیننی کی روپوشی پر جی ساری کی ساری الٹ پلٹ ہو کر رہ گئی۔ چونکہ وہ گڈ ٹائم کی قائل نہ تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، کیا نہ کرے۔ اسے پتہ نہ تھا کہ ان حالات میں ماڈرن گرل کو کیا کرنا چاہیے۔ لہذا وہ بکی بکی اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔ پھر وقار محل کی ٹھک ٹھک نے اسے گھیر لیا۔ وہ ٹھک ٹھک اس کے جسم میں دھنس گئی۔ اندر جا کر تالیاں بجانے لگی۔ سے اسکا نے لگی۔ اٹھو، کچھ کرو۔ اٹھو، کچھ کرو۔ ٹھک ٹھک۔ اٹھو کرو۔ ٹھک ٹھک۔

ماڈرن گرل ہونے کے باوجود جی کو جسم کے تقاضوں کے متعلق کچھ پتہ نہ تھا۔ جب وہ گیننی سے ملا کرتی تھی تو اسے یہ احساس نہ تھا کہ وہ جسم کا تقاضا پورا کر رہی ہے۔ اس نے تو ان جانے میں گیننی کو جیون ساتھی بنالیا تھا۔ اسے گیننی سے محبت ہو چکی تھی۔ جب گیننی چلا گیا تو بات ہی ختم ہو گئی۔ پھر محل کی کھٹ کھٹ اس کی رانوں میں کیوں گونجتی تھی۔ گھڑی کیوں چلتی تھی۔ جی تو وہ پریشان تھی۔ کئی ایک دن وہ پریشان رہی۔

پھر ان کے گھر میں حسنی آ گیا اور مزید پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔

حسنی ان کا بوئے سروٹ تھا۔ چھپنے ہی سے وہ کوٹھیوں میں کام کرتا رہا تھا۔ وہیں جوان ہوا تھا۔ ماڈرن بیگمات کے انداز دیکھ دیکھ کر وہ وقت سے پہلے جوان ہو گیا تھا۔ حسنی خاصا پٹو ڈیٹ تھا۔ کلین شیو، سارٹ لک، لمبے بال۔

اگرچہ جی نے اپنی عزت کا تحفظ کرنے کے لئے کلین شیو چہرے پر مونچھیں لگائی تھیں۔ اور یوں اپنے ذہن کو مطمئن کر لیا تھا لیکن جسم کو وہ کیسے سمجھاتی۔ جسم تو ایک بے سمجھ کر دینے والا دہقان ہے۔ وہ ذہن کی سیاست دانیوں کو نہیں سمجھتا۔ جھوٹے رکھ رکھاؤ کی ہیرا پھیریوں کو نہیں جانتا۔ عذاب اور ثواب کے فلسفے کو نہیں مانتا۔ وہ قدیم اور جدید کے امتیازات کو تسلیم نہیں کرتا۔ جسم غلیظ سہی لیکن مکار نہیں۔ وہ صاف بات کرتا ہے۔ دو ٹوک بات۔ سیدھی بات۔

جسم نے جی کے کان میں بات کہہ دی کہ تھرل صرف گینی سے ہی وابستہ نہیں۔ مونچھیں لگانے کے تکلف کے بغیر بھی تھرل حاصل ہو سکتی ہے۔ جسم کی یہ زیر لب جی کو بہت ناگوار گزری۔

اگلی صبح جب دھند لکا دور ہوا اور سٹیش کی دنیا پھر سے آباد ہوئی تو جی کی انا کو بڑا صدمہ ہوا۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔ یہ کیسے ہو گیا۔ ایک معمولی نوکر۔

سارا دن وہ اپنی نظر میں گرتی رہی۔ گرتی ہی چلی گئی۔ سارا دن وہ کوشش کرتی رہی کہ اپنے آپ کو سنبھالے۔ لیکن اس روز گویا یاسمین اس کے دل میں آگھسی تھی۔ جی اور یاسمین برسرِ ٹکرا تھیں۔

جی بار بار کہتی ”چلو ہو گیا ہے تو پھر کیا ہوا۔ اتنی چھوٹی سی بات پلے نہ باندھو۔“

یاسمین کہتی۔ ”اونہوں بات پلے باندھی نہیں جاتی، وہ تو بن پوچھے بن سوچے سمجھے آپ ہی آپ پلے بندھ جاتی ہے۔“

جی کہتی ”دل میلانہ کرو تم تو ایک ماڈرن گرل ہو جنس تو ایک ذاتی معاملہ ہے اسے روگ نہ بناؤ۔“

یاسمین کہتی ”تم ماڈرن گرل نہیں ہو۔ کوئی بھی ماڈرن گرل نہیں ہے۔ سبھی ماڈرن گرل بننا چاہتی ہیں۔ چاہنے اور ہونے میں بڑا فرق ہے۔“

اس روز سارا دن جی اور یاسمین میں کشمکش ہوتی رہی۔ سارا دن اس کے دل کی ہنڈیا میں جی اور یاسمین کی کچھڑی پکتی رہی۔

جی اور یاسمین کے جھگڑے کو سن کر اس کے کان پک گئے۔ وہ محسوس کرتی تھی جیسے وہ ان دونوں سے الگ تھلگ ہو۔

دفعاً اس کے ذہن میں خیال ابھرا۔ پھر میں کون ہوں؟ کیا میں یاسمین ہوں؟ نہیں میں یاسمین نہیں۔ کیا میں جی ہوں؟ نہیں میں جی بھی نہیں۔ تو پھر میں کون ہوں؟

صرف میں ہی نہیں ڈیڈی بھی تو ہیں۔ کیا ڈیڈی محمد عثمان ہیں؟ نہیں۔ کیا وہ ایم اوٹمان ہیں؟ نہیں۔ تو پھر ڈیڈی کون ہیں؟

اس گھر میں صرف ایک فرد می تھیں جو فاطمہ بیگم تھیں۔ خالی فاطمہ بیگم۔ جنہیں سب می کہتے تھے۔ نہ جانے کب سے کہہ رہے

تھے۔ جنہیں برسوں سے می بنانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ لیکن وہ امی تھیں اور امی ہی رہی تھیں۔ گھر میں صرف وہی تھیں جنہیں علم تھا کہ وہ کون ہیں۔

میں کون ہوں۔ یہ ایک بڑا ٹیڑھا سوال تھا۔ پندرہ برس تک وہ سمجھتی رہی تھی کہ وہ یاسمین ہے۔ دو سال تک وہ سمجھتی رہی تھی کہ جسمن ہے اور گزشتہ چار سال سے وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ جی ہے لیکن آج وہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی کہ میں کون ہوں۔ آج اس کے دل میں جی اور یاسمین کی کھچڑی پک رہی تھی۔

کیا میں جہی اور یاسمین کی کچھڑی ہوں۔ نہیں نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ میں کچھڑی نہیں ہوں۔ میں کبھی کچھڑی نہیں بنوں گی۔ میری ایک شخصیت ہے۔ میرا ایک سلف ہے۔ میں یاسمین بن سکتی ہوں۔ جہی بن سکتی ہوں لیکن کچھڑی نہیں۔ کبھی نہیں، کبھی نہیں۔

اس کے سامنے افعی آ کھڑی ہوئی۔ میں افعی ہوں۔ وہ سینہ ابھار کر بولی۔ خالص افعی۔ نہیں یہ جھوٹ بولتی ہے۔ یاسمین نے کہا۔ اگر یہ افعی ہوتی تو کبھی گھر چھوڑ کر نہ جاتی۔

اس چیخ چیخ سے گھبرا کر جی اٹھ بیٹھی اور کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ سامنے وقار محل کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ حسرت آلود تھی۔

جنی نے محسوس کیا جیسے محل سب کچھ جانتا ہو۔ ٹھک ٹھک، کھج... ڈی... ڈی۔۔۔۔۔ محل کی دیواریں چلا رہی تھیں۔

”نہیں تم جی ہو۔ جی۔“ اس کے دل سے آواز آئی۔ ”اس واقعہ کو بھول جاؤ۔“

”نہیں نہیں“ یا سمین بولی۔ ”بھولنا کافی نہیں۔ تمہیں اس داغ کو اپنے دامن سے دھونا ہوگا۔“

ٹھک ٹھک ٹھک۔۔۔۔۔ ٹوٹے ہوئے محل کی آوازیں جی کے کمرے میں گونج رہی تھیں۔ ٹک ٹک ٹک۔۔۔۔۔ ایک لرزش اس کے اندر رینگ رہی تھی۔

”نہیں نہیں“، جی گھبرا کر بولی۔ ”تم ایک ماڈرن گرل ہو۔“ ”نہیں نہیں“، یاسمین چلائی۔ ”تم وقار محل کے سائے میں پل کر جوان ہوئی ہو۔“

ٹھک ٹھک ٹھک۔۔۔۔۔ ٹوٹا ہوا محل کراہ رہا تھا۔ دفعتاً اس کا منہ سرخ ہو گیا۔ ”حسنی۔۔۔۔۔!“ اس نے یوں آواز دی جیسے ڈوبتی ہوئی کشتی میں سے کوئی مدد کے لئے چلا رہا ہو۔ ”حسنی۔۔۔۔۔!“

جی اور یاسمین ششدر رہ گئیں۔ ”یہ آواز کس نے دی؟ کس نے؟“

”حسنى۔۔۔۔۔!“ وہ پھر چلائی۔

وہ آواز منہ سے نہیں بلکہ جسم سے نکل رہی تھی۔



بت دیوتا اور سناٹا

تراخ، ایک دھچکا لگا جیسے کچھ ٹوٹ گیا گرد و پیش کی آوازیں مدہم پڑتی گئیں۔ مدہم پڑتی گئیں۔ ارے میں تیر رہا تھا۔ بے لہر سمندر میں تیر رہا تھا تیر تار ہا تیر تار ہا ایک گرداب مجھے کھینچ رہا تھا۔ ٹیالی سپیدی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ کالا بولا اندھیرا۔ میں ایک کنوئیں میں گر رہا تھا۔ گرا جا رہا تھا۔ گرتا رہا صدیاں بیت گئیں۔ وقت تھم چکا تھا۔ میں لا وقت ہو چکا تھا۔

ہوش آیا تو میں ایک وسیع نیلگوں دھندلکے میں ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ حرکت کی سکت نہ تھی۔ پھر جیسے روشنی کی ایک کرن مجھ پر پڑی۔ اس میں نموتھی۔ زندگی تھی۔ کرن قریب آتی گئی ور قریب اور قریب میں نے آنکھ کھولی میری روبرو ایک چہرہ تھا۔ منور چہرہ میں اٹھ بیٹھا۔ پھر سے بے لہر سمندر میں تیرنے لگا۔ وہ ایک دھندلا دھندلا وسیع میدان تھا۔ سامنے ایک عظیم ہیبت ناک قلعے کے دو ڈراؤنے برج نظر آرہے تھے۔ میدان میں بہت بڑا جھوم تھا۔ یہ کون سی جگہ ہے میں نے خود سے بات کی۔ کچہری ہے۔ ایک مدہم سی آواز آئی۔

میں نے تو کسی پر مقدمہ نہیں کیا۔

کسی نے بھی نہیں کیا۔

پھر یہ سب یہاں کیوں آئے ہیں۔

یہاں آنا ہی پڑتا ہے۔

میں تو یہاں رکنا نہیں چاہتا۔

نہ رکو۔ چلے جاؤ

کوئی پوچھے گا تو نہیں۔

اونہوں۔ کوئی نہیں پوچھے گا۔ لیکن....

لیکن کیا

لیکن تمہیں اک دن آنا ہی پڑے گا۔

وہ پکڑ کر لے آئیں گے کیا؟

نہیں۔ تم از خود آؤ گے۔ اپنی مرضی سے۔

اپنی مرضی سے؟

ہاں۔ آ کر کہو گے میں حاضر ہوں۔ میرا حساب چکایا جائے۔

دفعۃً برج پر لگا ہوا لاؤڈ سپیکر بولا۔ سناٹا چھا گیا۔

جہانگیر فرزند خاتون بیگم لاؤڈ سپیکر غرایا

میں چونکا یہ تو میرا نام ہے۔

تم بڑے خوش قسمت ہو۔ چار ایک آوازیں آئیں۔ یہاں تو لوگ نہ جانے کب سے گوش بر آواز بیٹھے ہیں۔ کہ کب آواز

پڑے۔

پھر دفعۃً منظر بدل گیا۔ میں ایک اور چوگان میں تھا جہاں چاروں طرف بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ اور دودھیا سویرا

چھایا ہوا تھا۔ سامنے وہی برج ایستادہ تھے ہیئت ناک وہاں اکیلے بیٹھے بیٹھے میں سوچنے لگا۔ میں کہاں آ گیا ہوں۔ کیا یہ دوسری زندگی

ہے۔

اونہوں پیچھے سے آواز آئی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے پیچھے ایک روشن مدبر چہرہ تھا۔

زندگی نہ پہلی ہے نہ دوسری بلکہ ایک تسلسل ہے۔

کیا یہ دوسرا جہان نہیں میں نے پوچھا

نہیں وہ بولا۔ بہت سے آسمان ہیں زمینیں ہیں لیکن جہاں ایک ہی ہے۔

مجھے آواز پڑی تھی نا۔

ہاں پڑی تھی۔

لیکن یہاں کوئی پوچھتا نہیں۔۔۔۔۔ کیوں؟

پوچھنے والے کی مرضی۔

یہ میدان خالی کیوں ہے؟
خالی تو نہیں۔

بڑے بڑے پتھر پڑے ہیں اور بس۔
پتھر نہیں ہیں۔

پوچھنے والے کی مرضی۔

یہ میدان خالی کیوں ہے؟
خالی تو نہیں

بڑے بڑے پتھر پڑے ہیں اور بس۔
پتھر نہیں ہیں

پھر جو میں نے غور سے دیکھا تو وہ پتھر نہیں تھے۔ بت تھے۔ اتنے سارے بت ہی بت ہی بت ہی بت کچھری میں بتوں کا
کیا کام۔ کیوں۔ کسی لیے

یہاں کیوں کس لیے نہیں پوچھا جاتا۔ یہ گستاخی ہے۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ آپ ہیں کون؟

میں ٹرائل اسسٹنٹ ہوں۔

کیسا ٹرائل

تمہارا ٹرائل

میرا ٹرائل ہوگا۔ کس بات کا؟

ہر بات کا۔

آپ جج ہیں کیا۔

نہیں وہ بولا میں رابطہ افسر ہوں۔

میں نے تو زندگی میں کچھ نہیں کیا۔ کچھ نہیں۔ کسی کا برا نہیں چاہا۔ کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ کسی کا حق نہیں مارا۔

نہ کرنا عمل نہیں۔ یہاں صرف عمل جانچتے ہیں۔ کہ کیا کیا۔ کیا یہ نہیں کہ کیا نہیں کیا۔
میں نے محبتیں ضرور کی تھیں۔ چار ایک ان میں ناجائز بھی تھیں۔
محبت کرنا جرم نہیں۔

سچ۔ لیکن ان میں ناجائز جو تھیں۔

محبت محبت ہوتی ہے۔ نہ جائز ہوتی نہ ناجائز۔

لیکن میری خواہشات پاکیزہ نہ تھیں۔

خواہشات عمل نہیں ہوتیں۔

تم یقین سے کہہ رہے ہو

ہاں یہی یہاں کا قانون ہے۔

جج کہاں ہے میں نے پوچھا۔

جج تم خود ہو۔

میں؟

ہاں تم۔

میں جج بھی ہوں مجرم بھی۔

ہاں تم مجرم بھی ہو۔ گواہ بھی اور جج بھی۔

میں حیرت میں ڈوب گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ میں سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔

دفعۃً میرے روبرو ایک حسین جاذب نظر متبسم چہرہ ابھرا۔ وہ چہرہ بہت مانوس تھا۔ بے حد مانوس۔

ارے یہ تو سفینہ ہے

پہچان لیا تم نے رابطہ افسر بولا۔

ہاں۔ یہ میری سفینہ ہے۔ میری پہلی محبت۔ میری نوجوانی کے ویرانے میں پہلا نخلستان

پتہ نہیں اس وقت مجھے کیا ہوا۔ سفینہ کو دیکھ کر بیتے ہوئے جذبات پھر سے ابھر آئے۔ جذبات کا وہی طوفان جس سے میں بچا

سال پہلے سرشار تھا۔ میں بھول گیا کہ کہاں ہوں کس کے حضور کھڑا ہوں۔ جوش میں میں بولے گیا بولے گیا۔

یہ وہ سفینہ ہے جس کے ساتھ میں نے ٹوٹ کر محبت کی۔ اس کے قدموں پر اپنا سر جھکائے رکھا جھکائے رکھا۔ ۱۶ سال۔ اس کے پاؤں پر اب بھی میرے سجدوں کے نشان موجود ہیں۔ سولہ سال میرے جسم کا انگ انگ۔ روح کا ذرہ ذرہ اس کی طرف متوجہ رہا۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے چلتے پھرتے ہر آن ہر لمحہ میں اس پر غار ہوتا رہا۔ میں نے اپنی ذات کو اس میں فنا کر دیا۔ یہ بت تھی اور میں بت پرست تھا۔ بچاری تھا۔ یہ چلتی تو اس کی چال میں لے نظر آتی۔ بیٹھتی تو اس کی پوز میں حسن ہی حسن محسوس ہوتا۔ بولتی تو چاندی کی گھنٹیاں بجتیں۔

سولہ سال میں نے اس دیوی کو منامنا کر گزار دیے۔ میری ہر نگاہ میں آرتی کے پھول ہوتے۔ میری سوچ کا ہر زاویہ اس کی سمت لے جاتا۔

دفعۃً میں رک گیا۔ رابطہ افسر سر جھکائے کھڑا تھا۔ سفینہ کے ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا تھا۔

میری محبت میں صرف ایک خاصی تھی۔ میں نے کہا۔ میری محبت جائز نہ تھی۔ مجھے اس سے محبت کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ یہ کسی اور کی ہو چکی تھی۔ میں نے پہلی بار اسے اس وقت دیکھا جب یہ دلہن بن کر ہمارے محلے میں آئی تھی۔ ڈولی سے باہر نکلی تھی۔ اس کا پور پور زندگی سے منور تھا۔ محلے کی لڑکیوں میں یہ یوں تھی جیسے کیکر کے پھولوں میں چنبے کی بوٹی ہو۔ اسے دیکھ کر محلے کے نوجوانوں کے دیدے پھٹ گئے۔ اسے نگاہوں نے گھیر لیا۔

نگاہوں پر ایسی چڑھی۔ اس قدر جھلائی گئی کہ نگاہوں پر جھولنا اس کا مقدر بن گیا۔ دفعۃً مجھے ہوش آیا کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔

اس سے پوچھ لیجئے میں نے رابطہ افسر سے کہا میں جھوٹ نہیں بول رہا۔

ہاں سفینہ بولی یہ سچ ہے کہ میں نگاہوں پر چڑھی۔ جھلائی گئی۔ آرزوؤں کا مرکز بنی۔ میری ارد گرد بت پرست ہی بت پرست تھے۔ انہوں نے مجھے بت بنالیا۔

واقعی اس شخص نے ٹوٹ کر محبت کی۔ سجدے بچھائے۔ اس شخص کو توجہ کی ایسی صلاحیت ملی ہے جو عورت کو پاگل کر دیتی ہے۔ رنگین توجہ۔ اٹوٹ توجہ۔ خوفناک توجہ۔ اس نے میرے ارد گرد توجہ کا ایک سنہرا جال بن دیا۔

بے شک اس نے ٹوٹ کر محبت کی لیکن اس کی محبت دینے والی محبت نہ تھی لینے والی محبت تھی۔ خود کو معدوم کرنے والی محبت نہ تھی۔ دوسرے کو زیر اثر کرنے والی محبت تھی۔ اس کی محبت میں تیاگ نہ تھا۔ شوکت نفس تھی۔

کیا کیا کیا غصے میں چلایا۔ یہ تم کہہ رہی ہو۔

شوکت نفس محبت نہیں ہوتی۔ رابطہ افسر گنگنایا۔

بولو میں جھوٹ کہتی ہوں، کیا سفینہ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ چلا چلا کر کہوں بالکل جھوٹ میں جواب دینے ہی والا تھا کہ مجھے میں سے وہ نکل کر میرے روبرو آ کھڑا ہوا۔ اسے دیکھ کر میں ہکا بکارہ گیا وہ میں ہی تھا میں خود۔

اس شخص نے بلاشبہ ٹوٹ کر محبت کی۔ اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ لیکن اس نے سفینہ سے محبت نہیں کی۔

کیا کیا کیا..... میرے حلق میں آواز نہ رہی تھی۔

سفینہ وہ بولا ایک حوالہ تھی۔ ایک بہانہ تھی۔ ایک پردہ تھی دراصل اسے اپنی بھابھی سے محبت تھی۔ اس کی بھابھی حسین تھی شوخ تھی طرحدار تھی۔ جس کے گھر میں یہ پرورش پاتا رہا تھا بھابھی سے محبت کا اظہار ممنوع تھا۔ ناجائز تھا۔ یہ خود سے اس کا اعتراف نہیں کر سکتا تھا۔ پھر منظر پر سفینہ آ گئی۔ اور یہ شخص غیر کے پاؤں پڑ گیا بے خودی نیاز میں۔ بھابھی دیوی تھی سفینہ بت تھی۔ اس نے خود کو دھوکہ دیا۔ بھابھی کو دھوکا دیا۔ سولہ سال کا مسلسل دھوکا۔

جھوٹ سراسر جھوٹ میں چلایا۔ تم کون ہو۔ جو میری ہی شکل میرے ہی روپ میں میرے سامنے آ کھڑے ہوئے ہو۔

یہ گواہ ہے رابطہ افسر بولا۔ یہ تمہارے اندر کا سچ ہے۔ میں وہ ہوں۔ گواہ بولا۔ جسے تم نے ساری زندگی بولنے نہ دیا۔ اس لیے کہ سچ کا سامنا کرنے کی تم میں ہمت نہ تھی۔ تم نے خود کو کبھی ایسے نہیں دیکھا جیسے کہ تم ہو بلکہ ہمیشہ ایسے دیکھا جیسے تم خود کو دیکھنا چاہتے تھے۔

لیکن لیکن میں چلا یا سفینہ اور میری محبت تو رسوائے عالم تھی اور۔۔۔

ہاں سفینہ بولی ہم دونوں رسوائے عالم تھے۔ تمہاری پاگل کر دینے والی توجہ نے میرا سب کچھ چھین لیا۔ میرا خاوند۔ میرے بچے۔ محلے والوں کی خوشنودی۔ یہاں تک کہ خود مجھے مجھ سے چھین لیا۔

کیا تم معصوم ہو۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہ تھا میں نے غصے میں پوچھا۔

میں ایک عورت ہوں وہ بولی مجھ میں ہر بات کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہے لیکن میں محبت بھری توجہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مرد کی توجہ۔ چاہے وہ سچی ہو جھوٹی ہو۔ پردہ ہو یا دکھاوا۔ پاکیزہ ہو یا ہوس بھری اس کے زیر اثر میں یوں پگھل جاتی ہوں جیسے مکھن چو لے کی حدت میں پانی ہو جاتا ہے۔ پھر وہ رابطہ افسر سے مخاطب ہو کر بولی اس شخص کے پاس خوفناک قسم کی توجہ ہے۔ جو بند بند میں اتر

جاتی ہے چیونٹوں کی طرح چڑھ جاتی ہے۔ کھا جاتی ہے۔ اس کی توجہ نے مجھے کھالیا۔ کھوکھلا کر دیا۔

گواہ آگے بڑھ کے بولا۔ اس کے پاس توجہ کے سوا کچھ نہیں کچھ نہیں۔ توجہ کا یہ گلدان محبت کے گلدستے سے خالی ہے۔ محبت دینے کا عمل ہے۔ اس شخص میں دینے کی صلاحیت مفقود ہے۔ یہ توجہ کا جال اس لیے بچھاتا ہے کہ پھانس لے جکڑ لے۔ اپنا بنا لے۔ حکمرانی کرے۔ یہ شخص کسی کی پوجا کیا کرے گا۔ یہ تو خود بت ہے شوکت نفس نے اسے بت بنا رکھا ہے۔

گرد و پیش میں حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مسلسل حرکت۔ مجھے ایسا لگا جیسے چوگان میں پڑے ہوئے بتوں نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ ان کے ہونٹ ہلے سارے چوگان میں ایک سرگوشی گونجی۔ بت بت۔ میں نے شرم سے گردن جھکالی۔ پتہ نہیں کتنی دیر ویسے ہی بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا۔ پھر قدموں کی آہٹ سن کر میں نے سر اٹھایا۔ میرے روبرو سعدیہ کھڑی تھی سعدیہ میری محبوبہ۔ وہی متبسم آنکھیں۔ شرارت سے ادھ کھلے ہونٹ۔ وہی شوخی۔ بے چینی۔ اضطراب۔

اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی۔ چہرہ متمتا گیا۔ نہیں نہیں۔ وہ رابطہ افسر سے مخاطب ہو کر بولی۔ میں اس شخص کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔ اس نے مجھ سے خوفناک قسم کا انتقام لیا تھا۔ نہیں نہیں میں چلایا میں نے تو تم سے محبت کی تھی۔

میں بھی یہی سمجھتی تھی کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ پھر دفعتاً پردہ ہٹ گیا اور میں نے دیکھا کہ تم محبت کی اوٹ میں مجھ سے انتقام لے رہے ہو۔ کتنا خوفناک انتقام تھا۔

پھر وہ رابطہ افسر سے مخاطب ہو کر بولی مجھے ایک خوبصورت اونچے لمبے شخص سے محبت تھی۔ اس کا نام جاہ تھا۔ یہ شخص جاہ کا رازدان تھا۔ جب جاہ اسے پہلی بار ہمارے سامنے لایا تو میں نے صاف صاف کہہ دیا نہیں نہیں۔ ہمیں اس کا لے کلوٹے ٹھٹھٹھ شخص سے کوئی سروکار نہیں لے جاؤ اسے لے جاؤ۔ لیکن جاہ کا اس کے بغیر گزارہ نہ تھا۔ اس لیے وہ اسے اپنے ساتھ لانے لگا۔ پھر اس نے اپنی باتوں کا جال بچھایا۔ اف اس کی باتیں۔ اتنی رنگین اتنی رس بھری اتنی حاضر جوابی۔ باتوں سے موہ لینے کے بعد اس نے اپنی توجہ مجھ پر مرکوز کر دی میں اس کی توجہ سے پاگل ہو گئی۔ جاہ کو بھول گئی۔ گھر والوں کو بھول گئی۔ سبھی کچھ بھول گئی۔ یہ بت بن گیا اور میں بچاری۔ پھر دفعتاً پردہ سرک گیا۔ اور اور میں نے دیکھا کہ محبت کے پردے میں مجھ سے انتقام لے رہا ہے چونکہ میں نے اسے کالا کلوٹا کہہ کر رد کیا تھا۔ مجھے ایک دھچکا لگا۔ خوفناک دھچکا۔ سب اٹھل پھٹل ہو گیا۔ پھر وہ مجھے پاگل خانے لے گئے اور میں پاگل رہی مہینوں پاگل رہی۔ نہیں نہیں میں اس شخص کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں اسے دیکھ کر مجھ پر وہی وحشت سوار ہو جاتی ہے۔ نہیں نہیں نہیں کہتی ہوئی وہ اٹے پاؤں چلنے لگی۔

میں نے محسوس کیا جیسے تمام بتوں نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ ان کے ہونٹ ہلے اور چوگان میں وہی سرگوشی گونجی۔ بت شرمسار ہو کر میں نے سر جھکا لیا۔ جھکائے رکھا جھکائے رکھا۔ پھر جو میں نے سر اٹھایا تو میرے سامنے آصفہ کھڑی تھی۔ اس کی محبت بھری نگاہیں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کے حزن و ملال بھی چہرے پر خوشی بھرا تبسم تھا۔

ہاں وہ بولی انہوں نے مجھ سے سچی محبت کی اتنی والہانہ محبت کی کہ میرے اندر شمعیں روشن ہو گئیں۔ ان کی محبت نے مجھے زندگی سے آشنا کر دیا۔ میرا تن من منور کر دیا۔ وہ رک گئی۔ جذبات کی شدت نے اس کی آواز بند کر دی۔

اگرچہ آصفہ نے کہا حالات ہم دونوں کے درمیان دیوار بن کر کھڑے ہو گئے اور ہم مل نہ سکے۔ لیکن میں نے ان کے خیال میں ساری زندگی تنہائی میں گزار دی ساری زندگی۔ پھر بھی کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں محبت کے وہ روشن لمحے جو انہوں نے مجھے عطا کئے انمول تھے۔ میں نے ساری زندگی ان کی روشنی میں گزاری ہے۔

یہ صاحب وہ بولی بڑے عظیم ہیں۔ انہیں محبت میں خود کو دینا آتا ہے۔ میں نے ساری زندگی ان کی پوجا کی ہے۔ مجھ میں سے نکل کر گواہ پھر میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ قہقہے لگا رہا تھا۔ تحقیر بھرے قہقہے۔ تم کتنی معصوم ہو آصفہ۔ نہیں نہیں آصفہ چلائی۔ میں ان کے خلاف ایک لفظ نہیں سنوں گی۔

اس شخص نے جان بوجھ کر تمہیں دھوکا دیا گواہ بولا۔ اس کی محبت جھوٹ تھی فریب تھا۔

آصفہ نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ مت کہو مت کہو وہ چلائی۔ اس قدر ٹوٹ کر محبت کرنے والا شخص فریبی نہیں ہو سکتا۔ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ پجاری کے سامنے دیوتا کی تندہ نہ کرو نہ کرو۔ میں نہیں سن سکتی۔ یہ کہتے ہوئے وہ پچھلے پیروں چلنے لگی اور چند ساعت میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اسے کہتے ہیں۔ محبت گواہ بولا۔ اور تم..... تم۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ یاد ہے تمہیں۔ جب تم آصفہ سے ملے تھے۔ اس وقت وہ عالم شباب میں تھی اور تمہاری عمر ڈھل چکی تھی۔ اس وقت تمہارے دوستوں نے تم سے کہا تھا جناب آصفہ پر ڈورے نہ ڈالو بے کار ہے۔ اب تمہارے تلوں میں تیل نہیں ہے اس بات پر تم ضد میں آ گئے تھے اور اپنا مان ثابت کرنے کے لیے تم نے اپنی توجہ سے آصفہ کی زندگی تباہ کر دی۔ کیا اسے محبت کہتے ہیں۔ تف ہے تم پر۔

میں نے شرم سے گردن جھکا لی۔

اس وقت ایک عجیب بات عمل میں آئی۔ میرے حلق سے ایک گہمیر آواز بلند ہوئی پروقار پر ہیبت، بت۔

چوگان میں پڑے ہوئے تمام بتوں کی گردنوں میں حرکت ہوئی۔ ایک مدہم سی سرگوشی گونجی۔ بلند ہوتی گئی۔ اور بلند اور بلند حتیٰ کہ تمام گرد و پیش گونجنے لگا۔ بت بت۔ بت بت۔

میں نے محسوس کیا کہ میرا نچلا دھڑ پتھر کا بنا جا رہا ہے۔ آہستہ آہستہ پتھر اوپر کی طرف بڑھتا گیا بڑھتا گیا۔ یہ کیا ہو رہا ہے میں نے گھبرا کر رابطہ افسر سے پوچھا۔

وہ مسکرایا۔ بولا۔ تم نے خود فیصلہ سنا دیا ہے۔ تمہارے فیصلے پر عمل در آمد ہو رہا ہے۔ اس عمل کو کوئی نہیں روک سکتا۔ کوئی نہیں روک سکتا۔

عین اس وقت ایک مہیب آواز آئی جیسے بادل کڑکتا ہے۔ سرگوشی بند ہو گئی۔ سناٹا چھا گیا۔ چھائے رہا چھائے رہا۔ صدیاں بیت گئیں۔ سارا ماحول سہا ہوا تھا بے حس و حرکت تھا۔ خاموش۔ منتظر پھر ایک پرہیز آواز آئی۔

ہم نے بندے تخلیق کئے تھے۔ لیکن وہ دیوتا بن بیٹھے۔

کیا ہمارے بندوں میں کوئی ایسا نہیں جو بندہ بن کر جیا ہو۔ بولو۔ جواب دو۔

جواب میں ایک گمبھیر سناٹا چھا گیا جو کائنات پر مسلط و محیط ہو گیا۔

